POCKET BOOK
13

بڑی دیدی

شرت چندر

1/-

چند لفظوں میں

یہ ایک نوجوان بیوہ کی کہانی ہے جو کہ ایک سادہ دل نوجوان پر فریفتہ ہو گئی تھی، لیکن وہ پھسلتے پھسلتے بچ گئی۔ اور وہ سادہ دل نوجوان جو کہ اُس کو ایک دیوی کی طرح پُوجتا تھا اُس کے لئے اپنی جان پر کھیل گیا شرت چندر کا یہ انوکھا اور دلچسپ ناول آپ ایک بار شروع کر کے بغیر ختم کئے نہ چھوڑیں گے۔

مشورہ پاکٹ بکس میں شائع ہونے والے تمام
کردار مقامات و واقعات فرضی ہیں اور ان کا
کسی شخص، جگہ، واقعہ یا ادارے سے کوئی تعلق نہیں
ہے۔ کسی فرد مقام یا ادارے سے مطابقت قطعی
اتفاقیہ ہے۔ اور اس کے لئے مصنف یا پبلشرز
کسی طرح کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتے

عام فہم اردو زبان میں مشہور و معروف ادیبوں کے لاجواب
اور معرکتہ الآرا شاہکار نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کرنیوالا ادارہ
مشورہ بک ڈپو۔ رام نگر، گاندھی نگر، پوسٹ بکس 1639 دہلی ۳۱

A/97

شرت چندر

بڑی دیدی

MIRZAS LIBRARY
No. 3/پ/21 Vol
Date

ناشران
مشورہ بک ڈپو
رام نگر۔ گاندھی نگر۔ پوسٹ بکس 1639 دہلی ۶

جملہ حقوق بحقِ پبلشرز محفوظ ہیں

پہلا ایڈیشن ـــــ اپریل ۱۹۶۰ء

ناشران
مشورہ بک ڈپو
رام نگر۔ گاندھی نگر۔ پوسٹ بکس 1639 دہلی ۶

قیمت فی کتاب ـــ صرف ایک روپیہ

(الجمعیۃ پریس دہلی)

دُنیا میں لوگوں کا ایک ایسا گروہ ہے جیسے پھُوس کی آگ کہہ سکتے ہیں فوراً ہی وُہ جل اُٹھتے ہیں اور جلدی سی بھی بُجھ سکتے ہیں۔ اُنکے لئے ہر وقت ایک ایسے آدمی کی ضرورت رہتی ہے جو بوقت ضرورت پھُوس ڈالتا رہے۔ اُنہیں بھڑکاتا رہے۔

گھروں میں بہو بیٹیاں مٹّی کا دیا سجاتے وقت جیسے اُس میں تیل اور بتّی ڈالتی ہیں ویسے ہی اُس میں ایک تیلی بھی رکھ دیتی ہیں۔ دیپک کی لَو گھٹنے لگتی ہے۔ تب اُس معمولی سی تیلی کی اشد ضرورت محسُوس ہوتی ہے۔ اُس سے بتّی بڑھائی جاتی ہے اُس کے بغیر تیل اور بتّی موجود ہونے پر بھی دیپک مُسلسل نہیں جل سکتا۔

سُریندر ناتھ کی عادت بھی کچھ اسی طرح کی تھی اُسمیں طاقت دماغ اعتماد سب کچھ تھا۔ لیکن پھر بھی وُہ اکیلے ہی کچھ کام کرنے سے معذور تھا۔ کام کا کچھ حصّہ تو وُہ بڑے جوش وخروش سے کرتا لیکن باقی ماندہ کام سُستی اور لاپرواہی کیوجہ سے چھوڑ کر چُپ چاپ بیٹھ جاتا۔ اُسوقت ایک ایسی ہستی کی ضرورت ہوتی جو اُسے کام کرنیکی ترغیب دے اور اُکسائے۔

بنگال سے بُہت دُور یوپی کے ایک شہر میں سُریندر کے والد وکالت کیا کرتے تھے۔ بنگال کے ساتھ اُنکا کوئی تعلق نہ تھا۔ اُس شہر میں بیس سال کی عمر میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرلی تھی۔ اُسمیں کچھ تو اُسکی اپنی لیاقت شامل تھی اور کچھ اُسمیں سوتیلی ماں کا ہاتھ تھا۔ وُہ سوتیلی ماں جس پیار اور لگن سے اُسکی دیکھ بھال کرتی تھی اُس سے ایسا جیسے اُسکی اپنی کچھ اہمیت ہی نہیں اور سُریندر نام کی کوئی ہستی اِس دُنیا میں تھا ہی نہیں سوتیلی ماں کی تمنائیں ایک انسان کے رُوپ میں کام کاج کرتیں، سوتی بیٹھتی، پڑھتی لکھتی امتحان دیتی اور پاس ہوتی تھیں۔ یہ کہنا ٹھیک ہوگا۔ یہ سوتیلی ماں اپنے پیٹ کے لڑکے کے تئیں کچھ لاپرواہ ہونے پر بھی سُریندر کی دیکھ بھال میں رتی بھر بھی فرق نہ

آنے دیتی تھی۔ سُریندر کی دیکھ بھال کی کوئی انتہا نہ تھی۔ سُریندر کا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اُسکی نظروں سے چھُپ نہ سکتا تھا۔ اِس بااُصول عورت کی زیرِ شفقت اور زیرِ سایہ رہ کر سُریندر نے لکھنا پڑھنا تو سیکھ لیا لیکن خود اعتمادی اور خودپروری سے کوسوں دُور رہا۔ اُسے اپنی ذات پر اور اپنی طاقت پر ذرا بھر بھی بھروسہ نہ تھا۔ وُہ یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اکیلے میں وُہ کوئی کام پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ کسوقت اُسے کس چیز کی ضرورت ہوگی اور کسوقت اُسے کیا کرنا ہوگا؟ یہ سب ٹھیک کرنے کی ذمہ داری مکمل طور پر کسی دوسرے آدمی پر ڈالے رکھتا تھا۔ نیند محسُوس ہو رہی ہے یا بھوک لگی ہے۔ یہ بھی وُہ اکثر نہ سمجھ پاتا تھا۔

جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا تب سے ہی سوتیلی ماں کے سہارے رہ کر اُس نے پندرہ سال گزار دیئے تھے۔ اِسی وجہ سے سوتیلی ماں کو اِس بیٹے کے پیار، غصہ، بھڑکنے، ڈانٹنے، اور مُنہ بنانے میں چوبیس ۲۴ گھنٹوں میں بائیس ۲۲ گھنٹے بتانے پڑتے تھے۔ علاوہ ازیں جس سال سُریندر کو امتحان دینا ہوتا اُسی سال ہی سے اُسے رات رات بھر جگانے کیلئے بیچاری ماں کو بھی رات کی راحت افزا نیند سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ سوت کے لڑکے کیلئے کون عورت اِتنا کر سکتی ہے؟ سب اڑوسی پڑوسی اِسی وجہ سے رائے بابُو کی بیوی کی تعریف کرتے تھے۔

سُریندر کیلئے سوتیلی ماں کے دل میں پیار اور لگن میں رتی بھر بھی کمی نہ ہونے پاتی تھی۔ جب کبھی اسکی سوتیلی ماں بیٹے کو جھڑکتی یا ڈانٹتی اس پر بیٹے کا چہرہ تمتما اُٹھتا اور آنکھوں میں آنسو آجاتے تو اُسے بخار کا پیش خیمہ سمجھ کر وُہ بیٹے کو تین دن لگاتار صرف ساگودانہ کھلانے سے کبھی نہ چُوکتی تھی۔ بیٹے کی تعلیم و تربیت کے بارے میں تو اُسکی نظر اور بھی تیکھی تھی۔ اگر کبھی سُریندر کے جسم پر اچھے اور ماڈرن قسم کے فیشن دار کپڑے دیکھ لیتی تو لڑکے کی شوقینی اور بابُو بننے کی تمنا کو فوراً اُتار جاتی۔ اور پھر اُسی دم دو تین ہفتوں کیلئے کپڑوں کا دھوبی کے گھر جانا بند کر دیتی

اِسی طرح سُریندر کے دن بیت رہے تھے۔ ایسی پیار بھری مگر کڑی نگرانی میں رہتے ہُوئے کبھی کبھی سُریندر کو محسُوس ہوتا جیسے اُسکی زندگی، زندگی کہلانے کی مستحق نہیں۔ کبھی وہ سوچتا شائد ہر آدمی کی ابتدائی زندگی اِسی طرح کی ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی اُسکے یار دوست

اُس کے ذہن میں کچھ دُوسری ہی نوعیت کی باتیں ٹھونس جاتے تھے۔

ایکدن ایسا ہی ہُوا۔ ایک دوست نے سُریندر کو مشورہ دیا کہ اُس جیسا لائق لڑکا ولایت جا سکے تو مُستقبل میں بڑی ترقی کی اُمید کیجا سکتی ہے۔ اپنے مُلک میں واپس آ کر وہ لوگوں کی بہت اچھی طرح سے خدمت کر سکتا ہے۔ یہ بات سُریندر کے مَن کو بھی جچ گئی۔ جنگلی چڑیا کے برعکس قفس میں مقید چڑیا ہی زیادہ چھٹپٹاتی ہے۔ سُریندر تصوّرات کی دُنیا میں پہنچ گیا جہاں کُھلی ہوا اور آزادی تھی۔ اُس کا بیقرار دِل قیدی پرندے کی مانند آزاد ہونے کیلئے قفس میں چھٹپٹاتا ہوا ٹکریں مارنے لگا۔

سُریندر نے پِتا کے پاس جا کر التجا کی کہ مجھے ولایت بھیجنے کا انتظام کر دیجئے۔ ولایت کا سفر کرنے سے جو ترقی کی اُمید اُس نے سُنی تھی وہ بھی اُس نے پِتا کے گوش گزار کر دی۔ پِتا نے کہا "سوچونگا"۔ لیکن بیوی کی رائے ایک دم اُس کے خلاف پائی گئی۔ وہ باپ بیٹے کے درمیان آندھی کی مانند آ کر اِس زور سے گرجی کہ دونوں سناٹے میں آ گئے۔

اُس نے کہا: "تو پھر مجھے بھی ولائیت بھیج دو نہیں تو وہاں سُریندر کی دیکھ بھال کون کریگا؟ جسے یہ بھی معلُوم نہیں کہ کسوقت کیا کھانا ہے؟ کسوقت کیا کرنا ہے؟ اُسے اکیلے ہی ولائیت بھیج رہے ہو؟ اسکو بھیجنا گھر کے گھوڑے کو بھیجنے کے برابر ہے۔ کیونکہ جانور وغیرہ اتنا تو سمجھ لیتے ہیں کہ اُنہیں بھوک لگی ہے یا نیند محسوس ہو رہی۔ تمہارے لڑکے کو تو اِتنا بھی معلُوم نہیں ہوتا"۔ اِتنا کہہ کر وہ طنزیہ ہنسنے لگی۔

بیوی کو اِس طرح ہنستے ہُوئے دیکھ کر رائے بابو بہت شرمندہ ہُوئے۔ سُریندر نے بھی محسوس کیا کہ اس طرح کی بہادر اور بیخوف عورت کی مخالفت کرنا اُسکے بس کی بات نہیں۔ اُس نے وِلایت جانیکی اُمید چھوڑ دی۔ اُسکے اُسی دوست نے یہ خبر سُنکر بڑے دُکھ کا اظہار کیا۔ لیکن وہ بھی نہ بتلا سکا کہ ولائیت جانے کیلئے اور بھی کوئی راستہ ہو سکتا ہے۔ بات چیت ختم ہوتے وقت اُس نے اِتنا ضرور کہا کہ اسطرح کسی کا محتاج ہونے کی نسبت بھیک مانگ لینا بہتر ہے اور یہ تو یقینی اَمر ہے کہ جو تمہاری طرح اتنی عزّت کے ساتھ ایم۔ اے کی ڈگری لے سکتا ہے۔ وہ کبھی بھی کسی جگہ بھی پیٹ بھر روٹی کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہو سکتا۔

سُریندر نے گھر پہنچکر اس مسئلہ پر سوچنا شروع کر دیا۔ وُہ جتنا ہی غور کرتا اُتنا ہی اُسے دوست کا یہ کہنا کہ "اِس سے بھیک مانگ کر کھانا بہتر ہے" ٹھیک محسُوس ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ سب لوگ ہی ولائیت نہیں جا پاتے۔ لیکن اُنہیں اِسطرح زندہ لاش بنکر زندگی نہیں گزارنی پڑتی ایکدن زیادہ رات گئے سُریندر گھر سے چلدیا۔ اسٹیشن آکر اُس نے کلکتہ کا ٹکٹ خریدا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ پتا کے نام اُس نے ایک خط لکھ کر پوسٹ کر دیا۔ اُس میں یہی لکھا تھا کہ "کچھ دنوں کیلئے میں گھر چھوڑ کر جا رہا ہُوں۔ بیکار ڈھونڈنے سے کچھ نہ ہوگا۔ اور اگر میرا پتہ چل بھی جائے تو میرے گھر آنے کی اُمید نہ رکھیے گا۔"

رائے بابُو نے بیٹے کا یہ خط بیوی کو بھی دکھایا۔ اُنھوں نے کہا "سُریندر اب سمجھدار ہو گیا ہے۔ پڑھ لکھ چکا ہے۔ پر نکل آئے ہیں اگر اب بھی وُہ نہ بھاگا تو اور کب بھاگے گا؟" پھر بھی پتا نے کھوج لگانے میں سُر توڑ کوشش کی لیکن بے سُود۔ کلکتہ میں جان پہچان کے جتنے بھی لوگ تھے اُن سب کو خط بھیجے لیکن کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہُوا۔ سُریندر لاپتہ ہی

گھما گھمی اور شور و غُل سے کلکتہ کی سڑکیں گلزار رہتی ہیں۔ اُن سڑکوں پر پہنچتے ہی سُریندر ششدر رہ گیا۔ ایسی افراتفری میں سُریندر کو کوئی ساتھی نہ مل سکا۔ کوئی جھڑکنے اور پھٹکارنے والا بھی نہ تھا۔ اور دن رات نگرانی کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ بھُوک، پیاس سے مُنہ سُوکھ جانے پر بھی کوئی اُسے گھُوم کر نہ دیکھتا تھا۔ اُداس ہونے پر بھی کوئی اُسکی طرف متوجہ نہ ہوتا۔ یہاں خُود ہی اپنی خبر گیری کرنی ہوتی ہے۔ آپ ہی اپنا دھیان رکھنا پڑتا ہے یہاں بھیک بھی مل سکتی ہے۔ پیار ملنے کی جگہ بھی ہیں۔ پناہ بھی مل جاتی ہے۔ لیکن کہیں اِن سب کیلئے کوشش اور سعی درکار ہے۔ اپنی مرضی سے کوئی خود تمہارے دُکھ میں شامل نہ ہوگا۔

یہاں اِس ماحول میں آکر سُریندر نے یہ سیکھا کہ کھانے کیلئے خود ہی جدّ وجہد کرنی ہوتی ہے رہنے کیلئے جگہ خود ہی تلاش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو جانے سے بھوک کی آتش ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ کھانا کھا لینے سے نیند کی خماری نہیں جاتی۔

گھر چھوڑے سُریندر کو کتنے ہی دِن ہو گئے۔ اَن گنت راہوں پر گھومنے سے اُسکا جسم بھی تھک کر چُور ہو گیا تھا اور پاس کا پیسہ بھی قریب الختم تھا۔ کپڑے میلے ہو کر پھٹنے بھی لگے تھے۔ رات کو پڑ کر سو رہنے بھر کو بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ سُریندر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر خط لکھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ شرم اور ہچکچاہٹ مانع تھی۔ سب سے بڑی رُکاوٹ یہ تھی کہ جب اُسکو سوتیلی ماں کا پیار بھرا چہرہ یاد آتا تب گھر جانے کی تمنا بجلی کے مانند غائب ہو جاتی۔

ایک دِن اپنے ہی جیسے غریب آدمی کو دیکھ کر سُریندر نے پُوچھا۔ "بھائی صاحب آپ لوگ یہاں کیا دھندا کر کے کھاتے پیتے ہیں؟"

وُہ آدمی کچھ سادہ لوح سا تھا۔ نہیں تو پُوچھنے والے کا مذاق اُڑاتا۔ اُسنے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "نوکری اور محنت مزدوری کر کے کماتے اور کھاتے ہیں۔ کلکتہ میں روزگار کی بھلا کیا کمی ہے ——— ؟"

سُریندر نے پُوچھا ——— "کیا آپ مجھے بھی کہیں کام دِلوا سکتے ہیں۔؟"

اُس نے پُوچھا ——— "تُم کون سا کام جانتے ہو ——— ؟"

سُریندر کوئی کام کرنا نہیں جانتا تھا۔ گُم سُم ہو کر سوچنے لگا۔

"کیا تُم کِسی بھلے گھر کے لڑکے ہو؟" اُس سادہ لوح اجنبی نے سوال کیا۔

سُریندر نے سر ہلا کر حامی بھر لی۔

"پھر تُم پڑھے لکھے کیوں نہیں؟"

"میں پڑھا لکھا ہُوں۔" سُریندر نے بتایا۔

اُس آدمی نے دَم بھر سوچ کر کہا ——— "تو تُم ابھی اِس طرف والے مکان میں جاؤ۔ اُس میں ایک بڑے زمیندار رہتے ہیں وُہ ضرور کچھ انتظام کر دینگے۔" اِتنا کہکر وُہ آگے بڑھ گیا۔

سُریندر اُس بڑے مکان کے پھاٹک کے قریب آیا اور ذرا ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر وہیں آ کر کھڑا ہو گیا اور پھر پیچھے لوٹ آیا۔ اُس دن وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکا۔ دوسرا دن بھی اسی طرح ہچکچاہٹ میں گزر گیا۔ وہ دو دن اسی طرح پھاٹک کے پاس پہنچ کر ہچکچاہٹ میں گزارنے کے بعد تیسرے دن ہمت کر کے سُریندر اندر چلا گیا۔ سامنے ایک نوکر کھڑا تھا۔ اُس نے پوچھا "کیا چاہتے ہو؟"

"زمیندار صاحب سے ملنا چاہتا ہوں"۔ سُریندر نے جواب دیا۔

"بابو جی ابھی گھر پر موجود نہیں ہیں"۔ نوکر نے بتایا۔

سُریندر کا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا۔ ایک بہت ہی پیچیدہ مسئلہ سے اُسے چھٹکارا مل گیا۔ زمیندار صاحب گھر پر موجود نہیں ہیں۔ نوکری کی بات کچھ نہ کہنا پڑا اور اپنی دکھ بھری داستان نہیں سنانی پڑی۔ یہی اُسکی خوشی کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ وہ دُگنے جوش و خروش سے واپس لوٹ آیا اور حلوائی کی دُکان میں بیٹھ کر پیٹ بھر کھانے کے بعد بڑے مزے میں کچھ دیر گھومتا رہا۔ اور دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ اگلے دن کس طریقے سے بات چیت کیجائے جس سے کچھ ٹھکانا بن جائے۔

لیکن دوسرے دن اُس میں نہ وہ جوش تھا نہ خروش۔ وہ جسقدر اُس مکان کے نزدیک پہنچتا گیا۔ اُتنی ہی اُسکے دل میں واپس لوٹ آنیکی تمنا زور پکڑتی گئی۔ پھاٹک کے ذرا نزدیک پہنچکر تو اُسکا دل بالکل ہی بیٹھ گیا۔ پاؤں کسی شرط پر بھی اندر داخل ہونے کو تیار نہ ہوئے وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے اُسے کوئی زبردستی اُسکی مرضی کے خلاف اندر دھکیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

لیکن پھاٹک پر کھڑے ہو کر انتظار کرنا وہ مناسب نہ سمجھتا تھا اسلئے اُسے اندر جانا ہی پڑا۔ اُسی نوکر سے پھر ملاقات ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ بابو صاحب اِسوقت گھر میں موجود ہیں۔ "کیا ملاقات کیجئے گا"۔ نوکر نے پوچھا۔

"ہاں!" اُس نے جواب دیا۔

"تو پھر چلے آیئے"۔ نوکر نے کہا۔

یہ اور بھی مشکل مرحلہ تھا۔ زمیندار کا مکان بہت وسیع اور عالی شان تھا۔ پورا

نما جی ڈھنگ تھا۔ تمام مکان انگریزی سامان اور انگریزی ڈھنگ سے مزّین تھا۔ کموں کے بعد دوسرا کمرہ تھا۔ سنگ مرمر کی سیڑھیاں تھیں ہر ایک کمرہ جھاڑ فانوس اور لال پردوں سے سجا ہُوا تھا۔ دیواروں پر قدآور آئینے آویزاں تھے کتنی ہی بیش قیمت تصویریں اور فوٹو لگی ہُوئی تھیں۔ بھلے ہی یہ سجاوٹ کسی اور کیلئے حیرانی کا باعث ہو۔ لیکن سُرندر کیلئے قطعی نہ تھی کیونکہ اُس کے والد کا گھر بھی کسی غریب کی کُٹیا نہ تھی۔ اور چاہے کچھ بھی ہو لیکن یہ بات تو قابلِ اعتبار تھی کہ وُہ کسی چھوٹے آدمی کی اولاد نہ تھا۔ سُرندر تو فقط اُسی ہستی کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا جس سے وُہ ملاقات کرنے اور خوشامد کرنے جا رہا تھا۔ وُہ کیا سوالات پُوچھینگے اور اُسے کیا جوابات دینے ہوں گے۔

لیکن اب تو یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہ تھا۔ گھر کے مالک سامنے ہی بیٹھے تھے۔

"کیا کام ہے؟"

آج تین دن سے سُرندر یہی بات سوچ رہا تھا لیکن یہاں آکر اُسکے حواس بگڑ گئے اور وُہ بوکھلا سا گیا۔ ہکلاتے ہُوئے کہنے لگا۔ "مَیں۔ مَیں ——————!"

زمیندار کا نام برج ناتھ لاہری تھا یہ بنگال کے ایک بڑے زمیندار تھے سَر کے بال کھچڑی ہوتے جا رہے تھے۔ نزلہ کی بیماری نہ تھی۔ عُمر کے مُطابق بالوں کا پکنا ٹھیک ہی تھا۔ بڑے آدمی ٹھہرے۔ جہاں دیدہ تھے۔ اسی لئے سُرندر کو ایک نظر دیکھتے ہی اسکے بارے میں سب کچھ سمجھ گئے۔ کہنے لگے۔ "ہاں ہاں! کیا چاہتے ہو تُم ——————؟"

"کوئی ایک ——————"

"کوئی ایک۔ کیا مطلب؟"

"نوکری ——————"

برج بابُو نے ہنستے ہُوئے کہا "یہ تُم سے کس نے بتایا کہ مَیں تمکو نوکری دے سکتا ہُوں؟"

راستے میں ایک آدمی سے مُلاقات ہُوئی تھی۔ مَیں نے اِس بارے میں پُوچھا تھا اُس نے آپ کا نام بتایا ——————"

"اچھا تمہارا گھر کہاں ہے ———— ؟"

"پنجاب میں ہے ————"

"وہاں تمہارے کون کون لوگ رہتے ہیں ———— ؟"

سُریندر نے سب کچھ بتا دیا۔

"تمہارے پتا کیا کام کرتے ہیں ———— ؟"

وقت کے چکر میں پھنسکر سُریندر نے نیا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ ذرا رُک کر جواب دیا۔

"ایک معمولی سی نوکری کرتے ہیں ————"

"اور اُسمیں گزارہ نہیں ہوتا۔ اِسلئے تُم نوکری کرنا چاہتے ہو۔ یہی بات ہے نا"۔

"جی ہاں ————"

"یہاں کس جگہ ہو ———— ؟"

"کوئی ایک جگہ نہیں ہے۔ کہیں بھی پڑ رہتا ہوں ————"

برج بابُو کے دل میں رحم کا جذبہ اُمڈ آیا۔ سُریندر کو پاس بٹھلا کر کہنے لگے

"تم اُبھی تک بچّے ہی ہو۔ اِس کچی عمر میں گھر چھوڑ کر یہاں آنے کیلئے مجبور ہوئے ہو۔ یہ سُنکر مجھے بڑا دُکھ ہوا ہے کہ میں بذاتِ خود تو تمہیں کوئی نوکری نہیں دے سکتا ہوں لیکن اِتنا ضرور کر سکتا ہوں کہ تمہاری نوکری کا کوئی نہ کوئی وسیلہ ضرور بن جائیگا"۔

"بہت بہت شکریہ" یہ کہہ کر سُریندر جانے کو تیار ہُوا۔ یہ دیکھ کر برج بابُو نے کہا۔

"اِس بارے میں کچھ اور پُوچھنے کی کیا تمہیں ضرورت نہیں ہے" ؟

"جی نہیں ————"

"کیا اِتنے سے ہی تمہارا کام ٹھیک ہو جائیگا ؟ تُم نے یہ تو جاننے کی کوشش بھی بھی نہیں کی کہ میں کیا کر سکتا ہوں اور کب کر سکتا ہوں ———— ؟"

سُریندر شرمندہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ برج بابُو نے ہنسکر کہا۔ "اب یہاں سے کہاں جانے کا اِرادہ ہے ———— ؟"

"کسی حلوائی کی دُوکان پر جانے کا ــــــــــ"

"کیا وہیں ناشتہ کرو گے ــــــــــ؟"

"جی ہاں۔ روزانہ وہیں کرتا ہُوں ــــــــــ"

"تمہاری تعلیم کہاں تک ہے ــــــــــ؟"

"جی یُوہی تھوڑا بہت جانتا ہُوں ــــــــــ"

"کیا میرے لڑکے کو پڑھا سکو گے ــــــــــ؟"

سُریندر نے خوشی سے اُچھلتے ہُوئے کہا۔ "جی ہاں پڑھا سکوُں گا ــ"

برج بابو پھر مسکرائے۔ سمجھے کہ شاید بھُوک اور افلاس سے اس لڑکے کے ہوش ٹھکانے نہیں رہے۔ کیونکہ کتنی عُمر کے لڑکے کو پڑھانا ہوگا۔ کیا پڑھانا ہوگا۔ یہ سب کچھ معلُوم کیئے بغیر ہی اِس طرح بھولا نہ سمایا یا پاگلپن نہیں تو اور کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر وُہ لڑکا بی۔ اے میں پڑھتا ہو تو تُم اُسے کیسے پڑھا سکو گے ــــــــــ"

سُریندر نے سنجیدگی سے سوچ کر جواب دیا۔ "تو بھی میں کام چلاوُں گا۔"

برج بابو نے مزید کچھ نہ کہا۔ نوکر کو بُلا کر کہا۔ "یا نکے اِن بابو صاحب کے رہنے کیلئے ایک کمرہ خالی کر دو۔ اور ان کے نہانے اور کھانے کا بندوبست کر دو۔"

اِس کے بعد سُریندر کی طرف دیکھ کر برج بابو نے کہا۔ "شام کے بعد میں تُم کو پھر بُلاؤنگا۔ تب تک تُم آرام سے یہیں میرے گھر میں رہو ــــــــــ"

دوپہر کو کھانا کھانے کیلئے اندر جا کر برج بابو نے اپنی لڑکی مادھوی کو اپنے پاس بُلا کر کہا۔ "بیٹی ایک دُکھی اور بے سہارا آدمی کو میں نے آج اپنے گھر میں پناہ دی ہے۔"

مادھوی نے پُوچھا۔ "کون ہے بابو جی ــــــــــ؟"

برج بابو نے کہا۔ "سوائے اسکے کہ وُہ ایک مُفلس اور دُکھی ہے میں اور کچھ اُسکے بارے میں نہیں جانتا۔ ہاں کچھ تعلیم یافتہ بھی ہے۔ کیونکہ تُمھارے بڑے بھائی کو پڑھانے کی بات کہتے ہی اُس نے منظُور کر لیا۔ جو آدمی بی۔ اے کے طالب علم کو پڑھانے کی لیاقت رکھتا ہے وُہ کم

از کم تمہاری چھوٹی بہن کو ضرور پڑھا سکے گا۔ میں سوچتا ہوں اُسے پرمیلا کیلئے ماسٹر رکھ لیا جائے۔

مادھوی نے اِس میں کچھ ہرج نہ سمجھا۔

شام کے بعد سُریندر کو بُلا کر برج بابو نے یہ بات کہہ دی۔ دُوسرے دن سے ہی سُریندر پرمیلا کو پڑھانے لگا۔

پرمیلا سات سال کی لڑکی تھی۔ وُہ گھر پر ہی پڑھتی تھی۔ اُس نے اپنی بڑی بہن مادھوی سے انگریزی کی پہلی کتاب مینڈک کی کہانی تک پڑھی تھی۔ اپنی کاپی، کتاب، سلیٹ اور قلم وغیرہ لا کر پرمیلا اپنے نئے ماسٹر کے پاس پڑھنے گئی۔

"ڈو ناٹ موو" سُریندر نے اُسے بتایا۔ "اس کے معنی ہوئے ہلو نہیں۔"

پرمیلا اِسے بار بار رٹ کر یاد کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد سُریندر نے بے دلی سے سلیٹ کھینچ لی پنسل سے مُشکل سوالات حل کرنے لگا۔ اِسی طرح سات آٹھ اور نو بجے گئے۔ پرمیلا کبھی اِدھر اُدھر کبھی اُدھر گھوم کر تصویر والے صفحے اُلٹا کر لیٹ کر بیٹھ کر گُنبد میں انگریزی مٹھائی کی ٹکیہ رکھ کر بیچاری گُم سُم سی مینڈک کے سارے بدن میں سیاہی پوتتی ہُوئی رٹتی جاتی تھی۔ do not move. یعنی ہلو نہیں۔

پرمیلا نے اُکتا کر کہا۔ "ماسٹر صاحب اب اندر جاؤں ——؟"

"جاؤ" سُریندر نے مختصر سا جواب دیا۔

سُریندر کا صُبح کا وقت اِسی طرح گُزرتا ہے لیکن دوپہر کے وقت کام کا ڈھنگ نرالا مختلف ہے۔ نوکری لگا دینے کیلئے برج بابو نے کئی بھلے آدمیوں کے نام چٹھیاں لکھ دی تھیں وُہ چٹھیاں جیب میں رکھ کر سُریندر دوپہر کو نوکری کی تلاش میں نکل جاتا۔ پتہ لگانے لگاتے لوگوں کے گھر و بنگلے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا۔ دیکھتا— "کتنا عالی شان مکان ہے۔ کتنی کھڑکیاں اور دروازے ہیں۔ کتنے کمرے ہیں۔ دُو منزلہ ہے یا تین منزلہ دروازے کے آگے کوئی لالٹین کا کھمبا ہے یا نہیں"۔ یُوں گھوم پھر کر وُہ شام سے پہلے ہی اپنے ڈیرے پر لوٹ آتا۔

کلکتہ میں آتے ہی سُریندر نے کتابیں خرید لی تھیں۔ کچھ گھر سے بھی ساتھ لے آیا تھا۔ گیس کی روشنی میں اُنہیں پڑھا کرتا۔ برج بابو نوکری کے بارے میں پُوچھتے تو کہہ دیا

تو خاموش رہتا یا کہہ دیتا۔ "بڑے آدمی سے ملاقات ہی نہیں ہوتی"۔

برج بابو کی دھرم پتنی کو مرے ہوئے چار سال ہو گئے۔ بڑھاپے کے اس دکھ کی شدت اور اہمیت کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جنہیں اس دکھ سے دوچار ہونا پڑا ہو۔ خیر چھوڑو اس بحث کو۔ برج بابو کی پیاری لڑکی مادھوی دیوی اس عمر میں پتی کو گنوا چکی ہے۔ اسی دکھ نے برج بابو کے جسم کا آدھے سے زیادہ خون چوس ڈالا ہے۔ انھوں نے بڑی دھوم دھام اور بڑے زور شور سے لڑکی کا بیاہ رچایا تھا۔ اپنے یہاں دولت کی افراط کے سبب انھوں نے یہ تحقیقات نہ کی کہ مخالف پارٹی کا آدمی دولت مند ہے یا نہیں۔ انھوں نے لڑکے کی دولت زمین جائیداد نہ دیکھ کر اسکو تعلیم، شکل، صورت، صحت اور اچھے کردار کو ہی اہمیت دی۔ یہ سب خصوصیات دیکھ کر ہی انھوں نے مادھوی کا بیاہ رچایا تھا۔

گیارہ سال کی چھوٹی سی عمر میں ہی مادھوی کی شادی ہو گئی تھی۔ تین سال تک وہ سسرال میں ہی رہی وہاں پیار، عزت سبھی کچھ اسے ملا تھا لیکن اس کا پتی یوگندر ناتھ موت کے بے رحم پنجہ سے کسی طرح بھی نہ بچ سکا۔ مادھوی کے اس جنم کی تمام تر خواہشات اور تمناؤں کا گلا گھونٹ کر اور برج بابو کے سینے میں ایک نہ بجھنے والی آگ لگا وہ ہونہار لڑکا راہی ملک عدم ہو گیا۔ یوگندر کے مرنے کے وقت جب مادھوی بلک بلک کر رونے لگی۔ تب پتی نے ہلکے سے دھیمے لہجہ میں کہا۔

مادھوی تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ یہی مجھ کو سب سے بڑا دکھ ہے۔ مرنے سے مجھے کوئی نقصان نہیں لیکن تم زندگی بھر غموں اور مصیبتوں میں گھری رہو گی۔ یہ سوچ کر دل بیقرار ہو جاتا ہے اور روح تڑپ اٹھتی ہے۔ جی بھر کر تمہیں پیار بھی نہ کر سکا اور وہ عزت بھی نہ دے سکا جو دینا چاہتا تھا۔

یوگندر کے بہتے ہوئے آنسو ؤں کی لڑی اُسکے گالوں پر لڑھک رہی تھی۔ پتی کے آنسوؤں کو اپنے آنچل میں جذب کرتے ہوئے مادھوی نے کہا "دوسرے جنم میں جب تمہارے پاؤں میں مجھے جگہ ملے گی تب مجھے جی بھر کے پیار کر لینا اور عزت بھی۔"

اِس پر یوگندر نے کہا "مادھوی دیکھو۔ میرے زندہ رہنے پر تمہارا مقصد یا فرض مجھے سُکھ پہنچانا ہی ہوتا۔ اَب اِس جیون میں تمہارا فرض ہے کہ سبھی نادار اور دُکھی لوگوں کو سُکھ پہنچانا۔ اُن کی سیوا کرنا جسکے چہرہ پر غم کی پرچھائیاں دیکھو۔ جسے غمگین اور اُداس دیکھو اُسے خوش کرنے کی کوشش کرنا۔ اور زیادہ کیا کہوں مادھوی.....!"

اور پھر مزید کہنے لگا۔ کہ ہمیشہ صحیح راستہ اختیار کرنا۔ تمہارے اچھے ہی کرموں سے میں تم کو پاؤں گا۔"

اُسی دِن سے مادھوی بالکل بدل گئی ہے تھوڑا بہت غصہ یا افسوس حسد وغیرہ کی جو اُس میں تھا بھی وُہ سب اُس نے پتی کی چِتا کی راکھ کے ساتھ ہی گنگا جل میں زندگی بھر کیلئے بہا دیا۔ اِس زندگی میں کتنی حسرتیں ہوتی ہیں۔ کتنے ارمان مچلتے ہیں۔ بیوہ ہو جانے پر دِل کے مُردہ ارمان چلے نہیں جاتے، وُہ حسرتیں مٹ نہیں جاتیں۔ مادھوی کے دلمیں جب کوئی تمنا کروٹ لیتی ہے تو وُہ پتی کی اُنہیں آخری وقت کی کہی ہوئی باتوں کو سوچنے لگ جاتی ہے جب وُہی نہیں ہے تو پھر کسی سے نفرت یا پیار کے کیا معنی۔ کِس کیلئے دُوسرے کو دُکھ دُوں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے تمام حقیر جذبات اُس کے دِل میں کبھی آئے ہی نہیں۔

وُہ ایک امیر آدمی کی لڑکی ہے۔ اُسکی کوئی خواہش، کوئی تمنا ایسی نہیں جو نہ بر آئی ہو۔ نفرت اور غصہ کرنا تو اُس نے سیکھا ہی نہیں۔ حسد، بُغض اور کینہ تو اُسکے پاس بھی پھٹکنے نہیں پاتے۔ مادھوی کے دلمیں کئی اُمنگیں مچلتی ہیں۔ کئی محبت اور پیار کے پھُول کھِلتے ہیں اُسکی دِل کی پھلواڑی میں پہلے جب وُہ سہاگن تھی۔ تب وُہ اِن خوبصورت پھولوں کی مالا گوندھ کر اپنے پتی کو پہنا دیا کرتی تھی۔ لیکن اب پتی کے نہ رہنے پر اُس نے پھُولوں کے اُس درخت کو کاٹ نہیں ڈالا۔ اَب بھی اُس میں ویسے ہی پھُول کھِلتے ہیں۔ لیکن وُہ مالا میں گوندھ کر

کسی کے گلے کا ہار نہیں بنتے بلکہ زمین پر گر پڑتے ہیں۔ لیکن مادھوی اُنہی پیار کے پھولوں کے گچھے کے گچھے مٹھی بھر کر نادار اور دُکھی لوگوں میں بانٹ دیتی ہے۔ رتی بھر بھی بخیلی سے کام نہیں لیتی۔ چہرے پر اُداسی کی لکیر بھی نہیں پڑنے دیتی۔ جہاں تک ہوتا ہے خوش رہنے اور دوسروں کو خوش رکھنے کی ہی کوشش کرتی ہے۔

برج بابو کی پتنی کا جس دن انتقال ہوا اُسی دن سے اِس میں بے ترتیبی بس گئی سب اپنی اپنی فکر میں مگن رہتے تھے۔ سب اپنے اپنے خیالوں میں ہی مستغرق تھے۔ کوئی کسی کا خیال نہ کرتا، کوئی کسی کی اور خاص دھیان نہ دیتا تھا۔ ہر کسی کیلئے ایک ایک نوکر مقرر تھا! اور وہ لوگ اپنے اپنے مالک کا کام کرتے تھے۔ رسوئی میں مہاراج بھوجن تیار کر دیتے تھے۔ اور کسی کھانے پارٹی کے مانند سب لوگ آ آ کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جاتے۔ کسی کو کھانے کو ملتا تھا کسی کو نہ ملتا تھا۔ بھوک کے مارے دُکھی کی کون خبر لیتا کوئی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔

جس دن مادھوی ساون بھادوں کی بھری گنگا کے مانند روپ، پیار اور ممتا لے کر سسرال سے پتا کے گھر لوٹ آئی تھی اُسی دن سے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اُس اُجڑے ہوئے خزاں رسیدہ چمن جیسے گھر میں پھر بہار لوٹ آئی ہے۔ اب سبھی اُس کو بڑی دیدی کہتے ہیں۔ سب ہی مادھوی کو بیحد چاہتے ہیں۔ گھر کا پالتو کتا تک بھی دن بھر کے بعد بڑی دیدی کو دیکھنے کے لئے بہت بیتاب دکھائی دیتا ہے۔ حقیر جانور کو بھی جیسے بڑی دیدی کے درشن کئے بغیر چین نہ پڑتا۔ گھر کے اِتنے آدمیوں میں سے ہر ایک گھر کے مالک برج بابو سے لیکر جمعدار، گماشتہ، منیم اور ادنیٰ نوکر تک سبھی بڑی دیدی کے پرستار ہیں۔ سب کے دِل میں اُس کی مُورتی اور اُس کا خیال ہے۔ سب ہی اُس کے سہارے رہتے ہیں۔ ہر ایک آدمی کو پکا اور زبردست اعتقاد ہے کہ چاہے جس وجہ سے ہو۔ بڑی دیدی پر اُسے دوسروں سے کچھ خاص زیادہ حق ہے۔

سورگ میں جس کلپ درکش کی بابت ہم سُنتے ہیں اُسے آنکھوں سے کبھی

دیکھا نہیں۔ اور یہ بھی نہیں جانتے کہ دیکھیں گے بھی کہ نہیں۔ لیکن یہ ضرور بغیر کسی حیل وحجت کے اور بغیر کسی شبہ کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ برج باؤ کے گھر کے لوگوں میں ایک زندہ کلپ ورکش مل گیا تھا۔ وہ کلپ ورکش مادھوی تھی۔ اُس کے پاس جاکر ہاتھ پھیلانے والا کبھی مایوس ہو کر نہیں جاتا تھا۔ مُراد پاکر ہی واپس آیا تھا۔

ایسے قابلِ تحسین وتعریف کُنبہ میں جگہ پاکر سُریندر کو ایک نئے ڈھنگ کا جیون گُزارنے کا طریقہ سُجھائی دیا۔ اُس نے جب دیکھا کہ سب نے ایک ہی آدمی پر اپنا بوجھ لاد دیا ہے تو اُس نے بھی وُہی کیا۔ اگرچہ دُوسروں کا بہ نسبت اُس کا عقیدہ مادھوی کے بارے میں کچھ اور تھا۔ وُہ سوچتا تھا اِس گھر میں بڑی دیدی نام کی کوئی زندہ شے رہتی ہے۔ وُہ سب کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ خبر لیتی ہے۔ سب کا مان رکھتی ہے خواہشات کو پُورا کرتی ہے۔ ضِدیں سہتی ہے۔ پہلے کلکتہ کی سڑکوں پر مارے مارے گھومتے وقت سُریندر کو اپنی آپ ہی فکر کرنی پڑتی تھی۔ لیکن جب سے وُہ اِس گھر میں آیا تھا تب سے تو یہ بالکل ہی بھول گیا تھا کہ اُسے ایک دِن اپنے لئے کچھ پرواہ کرنی پڑتی تھی یا مستقبل میں کرنی پڑے گی۔

کوٹ، کُرتہ، دھوتی، جُوتا، چھڑی وغیرہ جن اشیا کی ضرورت آدمی کو ہُوا کرتی ہے وُہ سب کافی مقدار میں سُریندر کے پاس موجود تھیں۔ رومال تک نہ جانے کون اُس کے لئے کپڑوں میں خیال کر کے ڈھنگ سے ساتھ رکھ جاتا تھا۔ پہلے اُسے یہ حیرت ہوتی کہ کون رکھ گیا ہے۔ جب وُہ پُوچھ تاچھ کرتا کہ سب چیزیں کہاں سے آئی ہیں تو جواب مِلتا بڑی دیدی نے بھیجی ہیں۔ آجکل تو ناشتہ پلیٹ میں رکھ کر آتا ہے اُسے دیکھ کر ہی وُہ سب سمجھ جاتا ہے کہ بڑی دیدی نے ہی اپنے ہاتھ سے سب سجایا ہے۔

ایک دِن سُریندر جب سوال حل کرنے بیٹھا تو اُسے کمپاس کی ضرورت محسُوس ہُوئی۔ اُس نے پرمیلا سے کہا "پرمیلا جاؤ۔ بڑی دیدی سے کمپاس مانگ لاؤ۔"

بڑی دیدی کو بھلا کمپاس سے کیا کام تھا۔ لیکن مادھوی نے فوراً بازار سے آدمی بھیج کر کمپاس منگوایا اور بھیج دیا۔ شام کو گھوم کر واپس لوٹنے پر سُریندر نے اپنی میز پر کمپاس رکھا دیکھا۔ دُوسرے دن صُبح ہی میلا نے کہا۔ ماسٹر صاحب دیدی نے کل ہی یہ بھیج دیا تھا ـــــ۔"

اس کے بعد کئی بار سُریندر نے کئی ایسی مزید چیزوں کی فرمائش کی جس کے لئے مادھوی کو بڑی پریشانیاں اُٹھانی پڑیں۔ بہت تلاش کرنے پر کہیں وہ مطلوب چیز ملتی۔ اور تب کہیں وہ سُریندر کی فرمائش پُوری کر پاتی۔ لیکن مادھوی نے یہ کبھی نہیں کہا کہ یہ چیز نہیں ہے۔

جیسے کمپاس نے بھی کہہ دیا۔" یہ میلا بڑی دیدی سے پانچ پُرانی دھوتیاں تو مانگ لاؤ۔ اِن کو اگر دلوا دیتی ہیں۔"

اکثر مادھوی کو اتنی فرصت نہ رہتی تھی کہ وہ نیا پُرانا دیکھ سکے۔ تب وہ ہی پانچ دھوتیاں اُٹھا کر بھیج دیتی تھی۔ اُوپر کھڑکی سے اُسے دِکھائی دیتا تھا کہ چار پانچ غریب اور دُکھی آدمی مسرّت سے پھولے نہ سماتے ہُوئے دھوتیاں لئے ہُوئے چلے جا رہے ہیں۔

سُریندر کے یہ چھوٹے موٹے ظلم ہر روز مادھوی کو سہنے پڑتے تھے۔ لیکن مادھوی اِن کی اتنی خوگر ہو چکی تھی کہ اُسے یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ اُن کی گرہستی میں ایک اور آدمی نے آکر اس کے کام کاج اور پریشانیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ مادھوی کو آج کل اِس نو وارِد کے متعلق بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بڑی مستعدی سے نگرانی کرنی پڑتی ہے بات یہ ہے کہ اگر سُریندر اپنی ضرورت کے مُطابق سب چیزیں مانگ لیا کرتا تب تو کچھ بھی فکر نہ ہوتی۔ لیکن بڑی بھاری فکر اور پریشانی کی وجہ تو یہ ہے کہ وہ بھولا بھالا

اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں مانگتا ہے۔ اپنے لیے کبھی چیز کی ضرورت ہی نہ بتاتا ہے۔ پہلے پہل تو مادھوی یہ بھی نہ جان پائی کہ سُریندر اپنے طرف سے بڑا لاپروا رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو صبح چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ وُہ پیتا ہی نہیں۔ ناشتہ کے لیے مٹھائی کبھی کبھی ویسی کی ویسی ہی رکھی رہ جاتی ہے ہاتھ تک بھی نہیں لگاتا۔ یہ ممکن ہے کہ کُتے ہی کو سب کھلا کر گھومنے چل دیتا ہو۔ رسوئی میں جب وُہ کھانے کو بیٹھتا ہے تو کھانے کی عزت ہی نہیں کرنا جانتا کچھ تھالی کے نیچے گراتا ہے۔ کچھ اِدھر اُدھر بکھیر دیتا ہے۔ جیسے کوئی چیز اُسے اچھی ہی نہیں لگتی۔ نوکر لوگ آکر کہتے ہیں "ماسٹر صاحب تو کچھ پاگل ہیں، خبطی ہیں، نہ کچھ دیکھتے ہیں نہ کچھ جانتے ہیں۔ نہ کبھی چیز کی پرواہ کرتے ہیں۔ فقط کتابیں لئے بیٹھے رہتے ہیں۔"

کبھی کبھی برج بابو پوچھتے ہیں ——— "کہو جی۔ نوکری چاکری کا کہیں کچھ پتہ چلا؟" اِس پر سُریندر ہمیشہ گول مول جواب دے کر ٹال دیتا ہے۔ مادھوی اپنے پتا سے سب کچھ سن لیا کرتی ہے۔ لیکن یہ بات فقط وُہ ہی جانتی ہے کہ ماسٹر صاحب نوکری کے لیے ذرا سی بھی جستجو نہیں کرتے۔ اور اُن کی نوکری کرنے کی طبیعت بھی نہیں ہے۔ جو کچھ انہیں حاصل ہے اُسی پر وُہ قانع ہیں۔ مطمئن ہیں۔

دس بجتے ہی سُریندر کو نہلانے اور ناشتہ کرنے کے لیے مادھوی کو بڑی تاکید کرنی پڑتی ہے۔ اچھی طرح کھانا نہ کھانے پر پرمیلا مادھوی کی طرف سے جھوٹی جھوٹی دے دیتی ہے۔ زیادہ رات گئے کتاب لئے بیٹھے رہنے سے آکر گیس کی بتی بجھا دیتے ہیں۔ منع کرنے سے بھی نہیں مانتے۔ کہتے ہیں —— "ہم کیا کریں بابو جی۔ بڑی دیدی کا یہی حکم ہے۔"

ایک روز مادھوی نے پتا سے مسکرا کر کہا۔ "بابو جی جیسی پرمیلا ہے ویسا ہی ماسٹر بھی اُسے ملا ہے۔" ———

برج بابو ــــ "کیوں ــــــــــــ؟"

مادھوی ــــــ "دونوں ہی بالکل بچے ہیں۔ جیسے پرمیلا کو ابھی تک اس کا علم نہیں کہ اسے کب کس چیز کی ضرورت ہے۔ کب کیا کھانا چاہیئے۔ کون وقت کس کام کے لئے مناسب ہے اپنے تئیں کچھ بھی تو نہیں سوچ سمجھ سکتی۔ بالکل یہی حال اس کے ماسٹر صاحب کا ہے وہ بھی اپنی کچھ فکر نہیں کرتے اپنے بارے اور اپنی ضروریات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ وقت بے وقت ایسی چیزیں منگوا بیٹھتے ہیں کہ ان کے ہوش و حواس کے درست ہونے پر شبہ ہونے لگتا ہے۔"

برج بابو کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا وہ مادھوی کا منہ تکنے لگے۔

مادھوی نے ہنسکر کہا ــــــ "آپ کی لڑکی (پرمیلا) کیا یہ جانتی ہے کہ کس وقت اسے کیا چاہیئے۔"

برج بابو ــــ "نہیں وہ نہیں جانتی۔"

مادھوی ــــ "اور کبھی کبھی کسی چیز کے لئے بے وقت ضد کر بیٹھتی ہے اور شور مچا کر گھر سر پر اٹھا لیتی ہے نا ــــــــــ؟"

برج بابو ــــ "ہاں وہ ایسا ہی کرتی ہے ــــــــــ"

مادھوی ــــ "بس ماسٹر صاحب بھی بالکل ایسا ہی کرتے ہیں ــــــــ"

برج بابو نے زور سے ہنس کر کہا ــــــــ "یہ لڑکا کچھ پاگل سا معلوم ہوتا ہے ــــــــ؟"

مادھوی ــــ "پاگل نہیں ہے بابو جی۔ وہ کسی بڑے آدمی کے لڑکے ہیں۔"

برج بابو نے حیران ہو کر پوچھا ــــ "یہ تم نے کیسے جانا بیٹی! ــــــ؟"

مادھوی کو اس کے بارے میں کچھ بھی علم نہ تھا۔ یہ تو فقط اس کا اپنا اندازہ تھا۔ وہ عقلمند تھی۔ اس نے دیکھا کہ سنسر اپنا کوئی کام اپنے ہاتھ سے

نہیں کر پاتا ۔ دوسروں کا مُنہ تکتا رہتا ہے ۔ دوسرا کوئی کرے تو کام ہو۔ نہیں تو پڑا رہے ۔ اس کی یہ عادت دیکھ کر ہی مادھوی سمجھ گئی کہ یہ ضرور کسی امیر و بڑے آدمی کا نورِ چشم ہے ۔ اُسے محسوس ہوتا کہ سب کچھ اُس کی عادات میں داخل ہے خاص طور پر اس نئے طریقے سے کھانے کی بجائے نے مادھوی کے خیال کو اور بھی تقویت پہنچاں ہے ۔ کھانے پینے کی کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس پر سُریندر کی خاص نظر ہو ۔ وہ کبھی بھی چیز کو سیر ہو کر نہیں کھاتا ۔ اُسے کسی چیز کی بھی خواہش نہیں ہے ۔ یہ بڑے بوڑھوں جیسا تیاگ اور ساتھ بچوں کی سی شوخی ۔ پاگلوں جیسا جنون ۔ کھانے کو دو تو کھا لیتا ہے ۔ اور نہ دو تو نہیں کھاتا ۔ یہ سب باتیں یہ عادات و اطوار مادھوی کو پُر اسرار سی معلوم ۔ اِسی لئے اِس اجنبی اور ناواقف ماسٹر پر ہر وقت چوری چھپے آنکھ رکھتی ہے ۔ سُریندر کوئی فضول چیز اپنے لئے کبھی نہیں مانگتا ۔ اِس لئے نہیں کہ شرم آتی ہے ۔ بلکہ اِس لئے کہ اُسے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی ۔ اور جب کوئی چیز مقصود ہوتی ہے تو وقت بے وقت کچھ نہیں دیکھتا ۔ بس ایک دم بڑی دیدی کے پاس مانگ پہنچ جاتی ہے ۔ مادھوی ہنستی ہے ۔ اپنے دل میں کہتی ہے ——— یہ آدمی بھی بالکل بچوں کی مانند معصوم اور بھولا ہے ۔

منورما مادھوی کی بچپن کی سہیلی اور ہمجولی ہے ۔ بہت دنوں سے مادھوی نے اُسے کوئی خط نہیں لکھا ۔ اپنے خط کا جواب نہ پا کر منورما روٹھ گئی تھی ۔ آج دوپہر کے بعد تھوڑا سا وقت نکال کر مادھوی اپنی سہیلی کو خط لکھنے بیٹھی ۔ اُسی وقت

اُس کی چھوٹی بہن پرمیلا نے آکر پکارا ـــــ "بڑی دیدی ـــــ!"

سر اُٹھا کر مادھوی نے پُوچھا ـــ "کیا ہے؟"

پرمیلا نے کہا "ماسٹر صاحب کی عینک نہ جانے کہاں کھو گئی ہے۔ لاؤ ایک عینک دے دو۔"

مادھوی زور سے ہنس پڑی بولی۔ اپنے ماسٹر صاحب سے جاکر کہو۔ "میں کیا عینک کی دُوکان لگائے بیٹھی ہُوں ـــــ؟"

پرمیلا دوڑی ہُوئی ماسٹر کے پاس جانے لگی تبھی مادھوی نے اُسے واپس بُلا لیا۔ "کہاں جاتی ہے ـــ ـــ؟"

پرمیلا ـــ ماسٹر صاحب سے یہی کہنے ـــــ"

مادھوی ـــ ماسٹر صاحب کے پاس جانے کی ضرورت نہیں تُو جاکر نیم جی کو بُلا لا ـــــ"

پرمیلا نیم جی کو بُلا لائی۔ مادھوی نے اُن سے کہا ـــ "ماسٹر جی کی عینک کہیں کھو گئی ہے نمبر دیکھ کر لئے اُن کے لئے ایک اعلیٰ قسم کی عینک لا دیجئے۔"

نیم جی کے چلے جانے پر مادھوی نے منورما کو خط لکھنا شروع کیا۔ خط کے اختتام پر یہ بھی لکھ دیا کہ ـــ پرمیلا کو پڑھانے کے لئے بابُو جی نے ایک عجیب ماسٹر رکھا ہے۔ اُسے سیانا بھی کہہ سکتے ہیں اور چھوٹا سا بچہ بھی۔ میں سمجھتی ہُوں اُس نے پہلے پہل پردیس میں قدم رکھا ہے۔ پہلے کبھی وُہ گھر سے باہر نکلا نہیں لگتا۔ وُہ دُنیا کی کوئی بات بھی نہیں جانتا۔ نشیب و فراز کو نہیں سمجھتا۔ اُس کی دیکھ ریکھ کرنا اور خبر لیتے رہنا نہایت ضروری ہے۔ نہیں تو لمحہ بھر بھی اُس کا کام نہیں چل سکتا۔ وُہ اپنی مدد آپ کرنا۔ اپنا کام خُود کرنا تو جانتا ہی نہیں۔ میرا اکثر وقت تو یہ ہی لے لیتا ہے۔ تم کو خط لکھوں تو کب اور کیسے۔ اگر جلدی تمھارا اِدھر آنا ہُوا تو تمہیں اِس

حیرت انگیز شخصیت کے درشن بھی کرا دوں گی۔ ایسا بانکا اور بھلکڑ اور لاپرواہ آدمی تم نے کبھی زندگی میں۔ دیکھا ہوگا۔ کھانے کو دو تو کھائے گا۔ اور کر نہ دو تو چپ چاپ بھوکا پیاسا پڑا رہے گا۔ شاید دن بھر اسے یہ خیال ہی نہ آئے کہ اس نے کھانا کھایا بھی ہے کہ نہیں۔ مطلب یہ کہ وہ ایک دن بھی اپنا کام نہیں کر سکتا۔ میں سوچتی ہوں کہ ایسے ایسے عجیب آدمی بھی دنیا میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں کہتی ہوں کہ ایسے آدمی گھر چھوڑ کر پردیس میں آتے ہی کیوں ہیں۔ سنتی ہوں کہ اس آدمی کے ماں باپ زندہ ہیں۔ مگر مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا دل پتھر کا ہے۔ میں تو ایسے آدمی کو لمحہ بھر کے لیے بھی آنکھ سے اوجھل نہیں کر سکتی۔"

مادھوی نے اس خط کے جواب از راہِ مذاق میں لکھ بھیجا ——

"تمہارے خط میں دیگر احوال کے ساتھ یہ خبر بھی پڑھنے کو ملی ہے کہ تم نے اپنے گھر میں ایک عجیب بندر پال رکھا ہے اور تم اس کی سیتا دیوی بن بیٹھی ہو۔ لیکن پھر بھی ہوشیاری سے رہنا میری مخلص رائے ہے۔

تمہاری منورما"

خط پڑھ کر منورما کے چہرے پر لالی دوڑ گئی۔ اس نے اس کے جواب میں لکھا ——

"تمہارا منہ تو بالکل بھاڑ ہے۔ تم اتنا بھی سمجھتیں۔ تم کو یہ بھی تمیز نہیں کہ کس کے ساتھ کیسی ہنسی کی جاتی ہے۔ کس کے ساتھ کیسا مذاق کرنا چاہیئے۔"

پرمیلا! تیرے ماسٹر صاحب کا یہ نیا چشمہ کیسا ہے؟ مادھوی نے پوچھا۔

"بہت اچھا دیدی"۔ پرمیلا نے جواب دیا۔

مادھوی —— "تم نے یہ کیسے جانا لیا ——؟"

پرمیلا —— "ماسٹر صاحب یہ چشمہ لگا کر خوب اچھی طرح کتاب پڑھتے ہیں۔ اس سے میں نے جب لیا کہ چشمہ اچھا۔

نِلو ٹمّلا ـــــ انھوں نے خود اپنی رائے کچھ نہیں دی۔

پرمیلا ـــــ "نہیں تو ـــــ"

مادھوی ـــــ "کچھ بھی نہیں کہا، پسند ہے یا ناپسند۔ کچھ بھی نہیں۔"

پرمیلا ـــــ "کچھ بھی نہیں کہا دیدی ـــــ"

ہمیشہ خوش رہنے والی مادھوی لمحہ بھر کے لئے اُداس ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی اُس جذبہ کو ختم کر کے اُس نے مُسکرا کر کہا ـــ اپنے ماسٹر صاحب سے کہہ دینا کہ اب پھر نہ لکھوا دیں ـــــ"

پرمیلا ـــــ "اچھا کہہ دوں گی ـــــ"

"ہشت پگلی۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟ انہیں شاید بُرا لگے۔" مادھوی نے کہا۔

"تو پھر کچھ بھی نہ کہوں؟" پرمیلا نے پوچھا۔

"نہیں۔" مادھوی نے جواب دیا۔

مادھوی کے بڑے بھائی کا نام شیو چندر تھا۔ مادھوی نے ایک دن اُس سے کہا ـــ "دادا۔ پرمیلا کے ماسٹر صاحب دِن رات آخر کیا پڑھتے رہتے ہیں۔ تمہیں کچھ معلوم ہے؟"

شیو چندر بی۔ اے کا طالب علم ہے۔ اُس کی نظر میں اِس جماعت کے طالب علموں کو پڑھانے والوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اِس لئے اُس نے لاپرواہی دکھاتے ہوئے کہا۔ ڈرامے اور ناول پڑھا کرتا ہے اور کیا پڑھے گا؟

مادھوی کو رتی بھر بھی یقین نہ ہوا اُس نے پرمیلا کے ہاتھ ـ چوری چوری شرت چندر کی ایک کتاب منگا کر اپنے دادا (بڑے بھائی) کے ہاتھوں میں دی اُور کہا۔ "یہ تو مجھے ڈرامہ یا ناول نہیں جان پڑتی" شیو چندر نے شروع کر آخر تک اُلٹ

پلٹ کر کتاب کو دیکھا۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ کتاب کون سی اور کس جماعت کی ہے۔ وہ فقط اتنا ہی سمجھ پایا کہ اُسے اِس مضمون کا ذرّہ بھر بھی علم نہیں اُسے اِس سے رتّی بھر بھی واقفیت نہیں ہے اور شاید کوئی حساب کی کتاب ہے۔

لیکن چھوٹی بہن کے سامنے اپنی ہیٹی کرانا پسند نہ تھا۔ کہنے لگا "یہ حساب کی کتاب ہے۔ سکول میں چھوٹی چھوٹی کلاسوں میں پڑھائی جاتی ہے"۔

مادھوی کا چہرہ اُتر گیا۔ اُس نے پھر پوچھا۔ کالج میں نہیں پڑھائی جاتی؟" شیو چندر جیسے سوکھ گیا۔ لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولا..." نہیں نہیں۔ یہ کچّی کوئی کتاب ہے"۔

شیو چندر اُس دن سے محتاط ہو گیا۔ دِل ہی دِل میں ڈرتا کہ کہیں سُریندر کسی وقت اُس سے کوئی سوال نہ کر بیٹھے۔ اور اُس کی قلعی کھل جائے۔ پھر پتا جی کے حکم سے اُسے بھی پرمیلا کے ساتھ ہی کاپی اور پنسل لے کر اِسی ماسٹر کے پاس پڑھنے بیٹھنا ہو گا۔ اِسی لئے وُہ سُریندر سے دُور دُور رہنے لگا۔

کچھ دن کے بعد ایک دِن مادھوی نے پتا سے کہا — "باپو جی میں کچھ دِنوں کے لئے کاشی جانا چاہتی ہُوں"۔

برج بابو بوکھلا سے گئے — "یہ کیسے ہو سکتا ہے بیٹی! تُم کاشی چلی جاؤ گی۔ تو اِس گھر کی حالت کیسی ہو جائے گی۔ یہاں کا کام کِس طرح چلے گا۔ اِس گھر کا تو نقشہ ہی بدل جائے گا۔————"

مادھوی نے ہنسکر کہا — "میں تو واپس آ جاؤں گی باپو جی۔ ہمیشہ کے لئے تھوڑے ہی جا رہی ہُوں"۔ مادھوی ہنسنے لگی۔ لیکن اُدھر پتا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُس نے یہ محسوس کیا کہ اس کا یہ کہنا ٹھیک نہیں تھا۔ بات سنبھالنے کے مقصد سے پھر کہا — "باپو جی میں فقط کچھ دِن ہی گھوم کر کے لوٹ آؤں گی"

"اچھی بات ہے ہو آؤ۔ لیکن بیٹے، یہاں کا کام کیسے چلے گا۔"

مادھوی — "کیا میرے بغیر کام رُک جائیں گے؟"

برج بابو — "کام تو نہیں رُک جائیں گے بیٹی۔ ہو گا سبھی کچھ۔ لیکن اِس گھر کی حالت "پتوار" ٹوٹ جانے پر بھنور میں پڑی ہوئی کشتی جیسی ہو جائیگی"

لیکن مادھوی کا کاشی جانا بہت ضروری تھا۔ وہاں اُس کی بیوہ نند اپنے اکلوتے لڑکے کے ساتھ رہتی تھی۔ اُسے ایک بار دیکھنے تو جانا ہی تھا۔

مادھوی نے کاشی یاترا کے بموجب ایک آدمی کو اپنے پاس بُلا کر کام سمجھائے اور سونپے۔ بُوڑھی نوکرانی کو بُلا کر اپنے پتا، بھائی، بہن کی خدمت کرنے کے لئے خاص طور پر مُقرر کیا۔ لیکن ماسٹر صاحب کی خدمت کا کام کسی کو نہیں سونپا۔ وہ بھول نہیں گئی تھی بلکہ جان بُوجھ کر ہی نہیں کیا۔ اِن دِنوں وہ ماسٹر صاحب سے کچھ چڑ سی گئی تھی۔ مادھوی نے اُس کی بڑی عزّت کی۔ اُس کو کسی طرح کی بھی تکلیف نہ ہونے دی۔ لیکن یہ کیسا پتھر دِل انسان ہے کہ ذرا زبان ہلا کر شکریہ تک ادا نہیں کیا۔ اِس لئے مادھوی پردیس جا کر اِس لامحدود دُنیا کے عجیب اور بے وقوف آدمی کو بتا دینا چاہتی ہے کہ وہ بھی ایک عورت تھی۔ کچھ تھوڑے سے مذاق میں کیا حرج ہے؟ اُس کی غیر حاضری میں اُس آدمی کے دن کس طرح کٹتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں کیا نقصان ہے؟ یہی وجہ تھی کہ سُریندر کے متعلق کچھ دیکھنے سُننے یا کرنے دھرنے کے لئے کسی سے کچھ بھی نہ کہا تھا۔

سُریندر ایک سوال حل کر رہا تھا۔ پرمیلا نے کہا۔ "بڑی دیدی تو کل رات کاشی چلی گئی۔ سُریندر کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگی۔ لیکن دو تین دن بعد اُس نے دیکھا۔ کہ دس بجتے ہی کھانے کے لئے تقاضا نہیں ہوتا۔ کئی دن ایک یا دو

تک نچ جاتے ہیں۔ نہانے کے بعد دھوتی بدلتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ دھوتی میلی ہے۔ ناشتہ پر کھانا بھی انواع و اقسام کا اور تازہ نہیں ہوتا۔ رات کو گیس کی بتی بجھانے بھی کوئی نہیں آتا۔ پڑھتے پڑھتے رات کے دو تین بج جایا کرتے ہیں۔ صبح کے وقت نیند نہیں کھلتی۔ اُٹھتے اُٹھتے بہت دن نکل آتا ہے دن بھر خماری سے میری آنکھیں بوجھل رہتی ہیں اور جسم جیسے ٹوٹتا رہتا ہے تب ماسٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ اس گھر میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہے۔ کچھ تغیر آگیا ہے۔ گرمی محسوس ہونے پر ہی پنکھے کی تلاش ہوا کرتی ہے۔ سُریندر نے کتاب پڑھتے پڑھتے سر اُٹھا کر پوچھا "بڑی دیدی کیسا آجکل یہاں نہیں ہیں پرمیلا؟"

پرمیلا ــــ "نہیں وہ کاشی گئی ہوئی ہیں ــــ"

"اسی لئے تو ــــ"

دو دن بعد اچانک پرمیلا کی طرف دیکھ کر سُریندر نے کہا ــــ "بڑی دیدی کب تک آجاویں گی پرمیلا ــــ"

پرمیلا ــــ "ایک مہینے کے بعد ــــ"

سُریندر پھر کتاب میں مستغرق ہو گیا۔ پانچ دن گزر گئے۔ سُریندر نے پنسل کو کتاب پر رکھ دیا اور کہا ــــ "پرمیلا مہینے میں اب کتنے دن باقی ہیں؟"

پرمیلا ــــ "ابھی تو بہت دن پڑے ہیں ماسٹر صاحب"۔ پنسل اُٹھا کر سُریندر نے عینک اُتاری اور اُس کی گرد صاف کرنے لگا۔ اس کے بعد پھر عینک لگا کر کتاب کی طرف دیکھنے لگا۔

دوسرے دن بولا ــــ "پرمیلا بڑی دیدی کو تم خط وغیرہ تو لکھتی ہو نا"

پرمیلا ــــ "ہاں لکھتی کیوں نہیں ــــ"

سُریندر ــــ "اُنہیں جلدی آنے کے لئے نہیں لکھتی تم ــــ"

پرمیلا ـــــ "نہیں تو ـــــــ"

سُریندر نے ٹھنڈی سانس بھر کر دھیرے سے کہا "اکیلے تو ـــــ"

پرمیلا نے کہا۔ "ماسٹر صاحب اگر بڑی دیدی آجائے تو بہت اچھا ہو"

سُریندر ـــــ "ہاں بہت اچھا ہو ـــــــ"

پرمیلا ـــــ "آنے کے لئے خط میں لکھ دُوں کیا ـــــــ؟"

سُریندر خوش ہو گیا، کہنے لگا۔ "ہاں لکھ دو ـــــــ"

پرمیلا ـــــ "آپ کے بارے میں بھی لکھ دُوں ـــــــ؟"

سُریندر ـــــ "لکھ دو ـــــــــ"

"لکھ دو" کہنے میں سُریندر کو کچھ بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ کیونکہ دُنیا کی دُنیاداری تو وہ جانتا ہی نہ تھا۔ بڑی دیدی سے پہلے آنے کے لئے کہنا خلافِ معمول ہوگا۔ یہ بات اُس کے دل میں ہی نہ آئی۔ جس کے موجود نہ ہونے سے اُسے بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کے بغیر اُس کا کام نہیں چلتا۔ اُس سے آنے کے لئے کہنے میں کوئی حرج محسوس نہ ہوا۔ جس آدمی میں خود انتظامی کی کمی ہے اور دُنیاداری سے کورا ہے۔ اُسے سماج سے دُور سمجھنا چاہیئے۔ جس سماج میں عام دُنیادار قسم کے لوگ رہتے ہوں اُس میں رہنا ایسے آدمی کے لیے ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ عام لوگوں سے اُس کے خیالات نہیں ملتے۔ مذاق نہیں بنتا۔ سُریندر کی فطرت میں دُنیاداری بہت کم تھی کہ جتنا اُسے ملتا اسی پر وہ صابر اور قانع ہو جاتا۔ زیادہ کے لئے جدّوجہد نہ کرتا۔ وہ جتنا کہ کسی کے بارے میں جانتا اُسی پر مطمئن ہو جاتا۔ زیادہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی دیدی کے متعلق اُس کی معلومات زیادہ نہ تھیں۔ اِس گھر میں اُس کے اتنے دن گزر رہے۔ تقریباً تین مہینے سے وہ بڑی دیدی پر اپنا بوجھ ڈال کر

سُکھ اور چین سے رہ رہا تھا۔ لیکن کبھی اُس نے یہ نہیں پُوچھا کہ بڑی دیدی کیسی ہیں۔ اُن کی عُمر کتنی ہے۔ وُہ دیکھنے میں کیسی ہیں۔ کتنی بڑی ہیں وُہ۔ اُن میں کتنی اور کیا کیا خاصیتیں ہیں۔ کیا کیا گُن ہیں اُن میں یہ سَب کچھ وُہ رتی بھر بھی نہیں جانتا تھا۔ کچھ جاننے کے بارے میں اُسے کچھ خیال ہی نہیں آیا۔ آدمی کو اُیسے فرزندی اور بڑا اہمیت اور پیار کرنے والے آدمی کے مُتعلق کچھ جاننے کی خواہش ایک بار بھی اُس کے دِل میں پیدا نہیں ہُوئی۔

سب لوگ دیدی کہتے ہیں۔ وُہ بھی دیدی کہتا ہے۔ سب بڑی دیدی سے پیار و محبّت پاتے ہیں۔ وُہ بھی پاتا ہے۔ وُہ سب کا خیال رکھتی ہے اُس کا بھی خیال رکھتی ہے۔ جہاں بھر کی چیزیں مادھوی کے پاس رکھی ہیں۔ جو آدمی جو کچھ چاہتا ہے وُہی پاتا ہے۔ سُریندر بھی اپنے لئے ضروری چیزیں منگوا لیا کرتا ہے۔ اِس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے؟ بادل کا کام ہے پانی برسانا۔ اور بڑی دیدی کا کام ہے لوگوں سے پیار کرنا اور اُن کا خیال رکھنا۔ جب بارش ہوتی ہے۔ تو جو کوئی ہاتھ پھیلاتا ہے اُسی کو پانی مِل جاتا ہے۔ ٹھیک اِسی طرح دیدی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے سب کو مقصُود چیزیں مِل جاتی ہیں۔ شاید مادھوی بادل کی طرح ہی ہے۔ اُس کے دِل میں کوئی اُرمان نہیں کوئی تمنّا نہیں۔ سُریندر نے مادھوی کے بارے میں اِس طرح کا خیال بنا رکھا ہے۔ اِس گھر میں آنے کے بعد ہی جو خیال سُریندر کے دِل میں مادھوی کے بارے میں بن گیا تھا۔ وُہ آج تک ویسے کا ویسا ہی ہے۔ کچھ تبدیلی نہیں ہُوئی اِس میں۔ ہاں اِس کاشی کے واقعہ کے بعد وُہ صرف اِتنا ہی سمجھ پایا ہے کہ بڑی دیدی کے بغیر اُس کا گزارہ گھڑی بھر بھی نہیں ہو سکتا۔

جب سُریندر اپنے گھر پر تھا تب اپنے پِتا اور سوتیلی ماں کو جانتا تھا۔ اُن کا کیا فرض ہے یہ بھی خُوب جانتا تھا۔ لیکن وہاں بڑی دیدی ایسی کسی بھی ہستی

سے وُہ متعارف نہ تھا۔ یہاں آکر جب تعارف ہُوا تب اُس کو یُوں ہی جان لیا۔ وُہ بڑی دیدی کی صُورت سے آشنا نہیں۔ وُہ نہیں جانتا کہ بڑی دیدی دیکھنے میں کیسی ہے۔ وُہ صرف نام سے ہی واقف ہے۔ اِس نام کی ہستی اُس کی کوئی نہیں۔ فقط نام ہی سب کچھ ہے۔

لوگ جس طرح اپنے دیوتا کو اصلی رُوپ میں نہیں دیکھ پاتے۔ صرف اُس کے نام کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ نام ہی کا جاپ کرتے ہیں۔ دُکھ اور مُصیبت میں نام کو ہی رٹ لگا کر اُس کے آگے اپنا دِل کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ گھٹنے ٹیک کر اور سر نیچو ڑا ہو کر رحم اور پیار کی بھیک مانگتے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں تو اُنہیں پُوچھ کر صاف دِل سے جیسے کسی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی دیکھ نہیں پاتے صرف زبان سے دو ایک ٹُوٹے پھُوٹے الفاظ ہی نکلتے ہیں۔ ٹھیک اِسی طرح سُریندر نے بھی دُکھ اور تکلیف پا کر پُکارا —— "بڑی دیدی"۔

دُور مشرق کی طرف سُرخی پھیل چکی تھی۔ ابھی آفتاب طلوع نہیں ہُوا تھا۔ کہ پرمیلا نے آکر سُریندر کے گلے سے لپٹتے ہُوئے کہا "ماسٹر صاحب"۔ سُریندر نے نیند اور سُستی سے بوجھل آنکھیں کھول کر کہا۔ "کیا ہے پرمیلا ——"

پرمیلا نے کہا۔ "بڑی دیدی آگئی ماسٹر صاحب ——"

مگر سُریندر اُٹھ بیٹھا۔ پرمیلا کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "چلو دیکھ آویں اُنہیں"۔

نہ جانے یہ دیکھنے کی تمنا اس کے دِل میں کیسے پیدا ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا

کہ اتنے دنوں کے بعد آپ پرمیلا کا ہاتھ پکڑ کر آنکھیں میچتے میچتے وہ کیوں اندر کی طرف چل پڑا۔ لیکن دو منٹ کے بعد ہی کچھ بھی ہوا اور پرمیلا کا ہاتھ پکڑ کر اندر گھس گیا اس کے بعد سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر چھت پر پہنچ گیا۔ مادھوی کے کمرے کے باہر دروازے کے قریب کھڑے ہو کر اس نے پکارا۔ "بڑی دیدی"۔

مادھوی کا خیال کسی اور طرف تھا۔ شاید وہ کوئی کام کر رہی تھی۔ اس نے عادت سے مجبور ہو کر پرمیلا سمجھ کر جواب دیا۔ "کیا ہے؟"

پرمیلا نے کہا: "ماسٹر صاحب آئے ہیں"۔

پرمیلا اور سریندر اندر داخل ہو چکے تھے۔ مادھوی یہ دیکھ کر گھبرا گئی۔ لمبا سا گھونگھٹ کھینچ کر ایک طرف سمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ سریندر نے کہنا شروع کیا ——

"بڑی دیدی تمہارے نہ ہونے کے سبب مجھے بڑی تکلیف ہوئی"۔

مادھوی نے گھونگھٹ کے اندر ہی شرم سے پانی پانی ہو کر دل میں کہا "چھی چھی"۔

مادھوی نے اپنے دل میں کہا۔ کیسی شرم کی بات ہے پھر دھیرے دھیرے کہا "پرمیلا ماسٹر صاحب سے کہہ دو کہ کمرہ میں چلے جائیں"۔

پرمیلا ناسمجھ بچہ ہونے پر بھی اپنی بہن کا سلوک دیکھ کر اتنا سمجھ گئی کہ یہ کام ٹھیک نہیں ہوا ہے۔ اس نے کہا۔ "باہر چلئے ماسٹر جی ——"

سریندر کچھ دیر بت بنا کھڑا رہا۔ اس کے بعد بولا "چلو" وہ اس سے زیادہ کچھ کہنا ہی نہ جانتا تھا۔ اس سے زیادہ بات چیت ہی نہیں کی۔ بات یہ تھی کہ دن بھر بادلوں گھرے رہنے کے بعد آفتاب کے نکل آنے پر جیسے یکایک لوگوں کی نظر اس طرف اٹھ جاتی ہے۔ لمحہ بھر کے لئے جیسے ہوش ہی نہیں رہتا کہ سورج کی طرف دیکھنا نہیں چاہئے

یا اُدھر دیکھنے سے آنکھوں میں درد ہونے لگے گا۔ اِس کا خیال نہیں رہتا۔ ٹھیک ویسے ہی سُریندر بھی مہینے بھر پردیس میں رہنے کے بعد آئی ہوئی بڑی دیدی کو بڑی خوشی اور بڑے ارمانوں سے دیکھنے گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اِس کا نتیجہ ایسا ہو گا۔

اُسی دِن سے سُریندر کو لوگوں کے سلوک میں فرق ہونے لگا۔ مادھوی کو جیسے کچھ جھینپ سی لگی۔ پندو مَوسی اِس بات پر شاید ایک مذاق بھی کر بیٹھی تھی۔ سُریندر بھی کچھ چوکنا ہو گیا۔ آج کل سُریندر کو یہ محسوس ہونے لگا کہ بڑی دیدی کا عظیم بھنڈار جیسے محدود ہو گیا ہے۔ بہن کا پیار، ماں کی ممتا جیسے اب اُس کو چھو بھی نہیں پاتا ہے۔ دُور ہی دُور ہٹتا چلا جاتا ہے۔ ایک دِن سُریندر نے پرمیلا سے پوچھا۔۔۔ "جانتی ہو پرمیلا بڑی دیدی آج کل مجھ سے ناراض ہیں۔ کیوں ہیں نا ــــــ؟"

پرمیلا ـــــ "جی ہاں"۔

سُریندر ـــــ "بھلا کیوں"۔

پرمیلا ـــــ "آپ اُس دِن کمرے کے اندر کیوں گھس گئے تھے"۔

سُریندر ـــــ "کیا اندر نہیں جانا چاہیئے"۔

پرمیلا ـــــ "اِس طرح کہیں کوئی چلا جاتا ہے۔ دیدی بہت ہی ناراض ہیں"۔

سُریندر نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔ "وہی تو ـــــــ"

ایک دِن دوپہر کے وقت بادل گھِر آئے اور موسلادھار بارش ہونے لگی۔ برج بابو آج دو دِن سے گھر پر نہیں تھے۔ علاقہ میں دورہ کرنے گئے ہوئے تھے۔ مادھوی کو کچھ کام نہ تھا وہ فرصت میں تھی۔ پرمیلا اُدھم مچا رہی تھی۔ مادھوی نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ جا اپنی کتاب لا۔ دیکھوں تو۔ تُو نے کیا پڑھا ہے ــــــ"

پرمیلا ہٹ پٹا گئی۔ "دیدی رات کو پوچھ لینا ابھی مجھے کھیلنے دو۔"

مادھوی نے کہا۔ "نہیں نہیں۔ ابھی لا۔ اِسی وقت ——————!"

بہت دُکھی سی ہو کر پرمیلا کتاب لینے چلی گئی۔ کتاب لا کر بولی۔ "ماسٹر صاحب تو آج کل کچھ پڑھاتے ہی نہیں۔ وہ خود ہی پڑھتے رہتے ہیں۔ مادھوی پچھلے سبق پوچھنے لگی۔ شروع سے آخر تک بہت سے سوال کرنے پر مادھوی کو معلوم ہو گیا کہ ماسٹر صاحب نے سچ مچ کچھ پڑھایا لکھایا نہیں ہے۔ علاوہ ازیں پہلے جو کچھ پڑھایا لکھایا گیا ہے وہ بھی ماسٹر رکھنے کے بعد اِن تین چار مہینوں میں بھول گئی ہے۔ مادھوی نے غصہ میں بندو کو آواز دی اور کہا۔

"جا کر ماسٹر صاحب سے پوچھ آ کہ اُنھوں نے اِتنے دِن تک کیا کیا ہے۔ کہ پرمیلا کو ایک لفظ بھی نہیں پڑھایا اُنھوں نے ——————؟"

بندو جس وقت پوچھنے گئی اُس وقت سُریندر ایک سوال حل کرنے میں مستغرق تھا۔ بندو نے پوچھا —— ماسٹر صاحب بڑی دیدی کہتی ہیں کہ آپ نے چھوٹی بیٹا کو کچھ پڑھایا کیوں نہیں؟"

ماسٹر صاحب نے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔ اب کی بندو نے زور سے پکارا۔

"ماسٹر صاحب!"

سُریندر —— کیا ہے ——————؟"

"بڑی دیدی یہ کہتی ہیں ——————"

"کیا کہتی ہیں۔ ——————؟"

"چھوٹی بیٹا کو ابھی تک آپ نے کچھ پڑھایا کیوں نہیں ——————؟"

اُس نے بڑے صاف لہجہ میں کہا۔ "مجھے پڑھانا اچھا نہیں لگتا۔"

بندو نے کہا۔ "واہ واہ" اور اُس نے جا کر مادھوی سے یہ سب کچھ کہہ ڈالا —— مادھوی کو غصہ آ گیا۔ اُس نے نیچے آ کر کواڑ کی آڑ میں کھڑے ہو کر بندو سے کہلوایا ——

"آپ نے پرمیلا کو کچھ پڑھایا ہی نہیں۔"

دو تین بار یہی سوال دوہرانے کے بعد جواب ملا ——— "مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔"

بندو نے پھر پوچھا ——— تو پھر آپ یہاں کس لئے ہیں؟"

سُریندر ——— "یہاں نہ رہوں تو کہاں جاؤں ———؟"

بندو ——— "تو پھر آپ پڑھاتے کیوں نہیں ———؟"

اب سُریندر کو ہوش آیا۔ اُس نے دھیان دے کر پوچھا۔ "ہاں تو کیا کہا؟" بندو اِتنی دیر سے جو کچھ کہہ رہی تھی پھر ایک بار دوہرا دیا۔ تب سُریندر نے کہا۔ "پرمیلا تو روز پڑھتی ہے۔"

بندو ——— "وہ تو پڑھتی ہے لیکن آپ کیا دیکھتے ہیں۔"

سُریندر ——— "مجھے دیکھنے بھالنے کا وقت نہیں ملتا۔ فرصت ہی نہیں ہوتی۔"

بندو ——— "تو پھر آپ اِس گھر میں رہتے کس لئے ہیں؟" سُریندر سنجیدگی سے خاموش ہو کر سوچنے لگا۔

بندو ——— "تو اُسے آپ پڑھا نہ سکیں گے ———؟"

مادھوی نے اندر سے خود ہی کہا ——— "پوچھو تو بندو پھر اتنے دِنوں سے جھوٹ بول کر یہاں کیوں رہتے تھے؟" بندو نے یہی کہا۔ یہ سُنکر سُریندر کے حساب کے سوال کا جال ایک دم چھن بنا ہو گیا۔ اُسے تھوڑا سا دُکھ ہُوا۔ لمحہ بھر سوچ کر کہنے لگا۔ "ہُوں تو۔ بڑی بھول ہُوئی مجھ سے ———

چار مہینے تک لگاتار بھول ہی ہوتی رہی آپ سے ———"

"ہاں ایسا ہی دِکھائی دیتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اِس طرف میرا اتنا خیال ہی نہ تھا۔"

دُوسرے دِن پرمیلا سُریندر سے پڑھنے نہ آئی۔ سُریندر نے بھی کچھ خیال

نہ کیا۔ اِس کے بعد تین دِن تک وُہ غیر حاضر رہی۔

چوتھے یا پانچویں دِن پرمیلا کو نہ دیکھ کر نوکر سے کہا ــــ "پرمیلا کو بُلا لاؤ۔"

نوکر نے آکر جواب دیا ــــ "وُہ اب آپ سے نہیں پڑھیں گی ــــــــ"

سُریندر ــــــ "تو کس سے پڑھینگی اب وُہ ــــــــ؟"

نوکر نے کہا ــــ "اَب نیا ماسٹر رکھا جائے گا ــــــــ"

نو بج چُکے تھے۔ اُس وقت کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد سُریندر نے دو تین کتابیں بغل میں دبا لیں۔ عینک اُتار کر ٹیبل پر رکھ دی اور چل پڑا۔

اُسے جاتے دیکھ کر نوکر نے پُوچھا ــــ "ماسٹر صاحب، اس وقت آپ کہاں جا رہے ہیں۔؟"

سُریندر ــــــ "بڑی دیدی سے کہہ دینا۔ میں جا رہا ہُوں ــــــــ"

نوکر ــــــ "تو اَب آپ نہیں آویں گے ــــــــ؟"

سُریندر نے یہ سُنا ہی نہیں۔ بغیر جواب دیئے وُہ پھاٹک سے باہر ہو گیا۔ دوپہر کے دو بج گئے۔ سُریندر لوٹ کر نہیں آیا۔ تب نوکر نے آکر مادھوی کو خبر کی۔ "ماسٹر صاحب چلے گئے"

"کہاں چلے گئے؟"

نوکر ــــــ "یہ تو میں نہیں جانتا۔ نو بجے کا وقت تھا۔ جاتے ہُوئے مجھ سے یہ کہہ گئے تھے کہ بڑی دیدی سے کہہ دینا ــ میں جا رہا ہُوں۔"

مادھوی ــــــ "یہ کیا۔ بغیر کچھ کھائے پیئے ہی چلے گئے؟"

مادھوی فکر مند ہو گئی۔ اُس نے خود سُریندر کے کمرے میں آکر دیکھا سب سامان اِسی طرح رکھا ہُوا ہے۔ ٹیبل پر عینک تک پڑی ہُوئی ہے۔ کچھ کتابیں نہیں ہیں۔

آفتاب دُور مغرب میں جا چھپا۔ فضا پر سُرمئی چادر سی پھیل گئی۔ کچھ دیر بعد مہتاب کے رُخ سے نقاب ہٹائی۔ رُخِ روشن سے نُور کی بارش ہونے لگی۔ لیکن سُریندر نہ آیا۔

دوسرے دن مادھوی نے دونوں نوکروں کو بُلا کر کہا: "تم اگر ماسٹر صاحب کو ڈھونڈ کر لے آؤ تو تمہیں دس روپے انعام ملیں گے"۔ انعام کے لالچ میں نوکر دوڑ دھوپ میں لگ گئے۔ لیکن شام کو نامراد و ناکام ہی لوٹ آئے۔

"بڑی دیدی کہیں پتہ نہیں لگ رہا ہے ماسٹر صاحب کا ——!"

پرمیلا نے روتے ہوئے کہا —"بڑی دیدی ماسٹر صاحب چلے کہاں گئے؟"

مادھوی نے اُسے بہلاتے ہوئے کہا۔ "باہر جا کر کھیل، یہاں روتی کیوں ہے!"

وقت کا بوڑھا بے رحم گھوڑا باقاعدگی سے دوڑتا رہا۔ جتنے دن بیتے جاتے تھے مادھوی کی پریشانی اُتنی ہی بڑھتی جاتی۔ بندو نے کہا —"جانے بھی دو اتنا ڈھونڈنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اتنے بڑے کلکتہ شہر میں کیا کوئی دوسرا ماسٹر ہی نہ ملے گا ——؟"

مادھوی نے بگڑ کر کہا —"دور ہو جا یہاں سے۔ ایک آدمی جس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ خالی ہاتھ چلا گیا۔ اور تو کہتی ہے اُس کے ڈھونڈنے کی ضرورت ہی کیا ہے ——؟"

بُندو —— "یہ آپ نے کیسے جانا کہ اُس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے؟"

مادھوی —— "میں خوب جانتی ہوں۔ تجھے اِن باتوں سے کیا مطلب؟ جا اپنا کام کر ——"

بُندو چپ رہ گئی۔ جب ایک ہفتہ گزر گیا اور سُرِندر لوٹ کر نہ آیا۔ نہ اُس کا کچھ پتہ چلا تب مادھوی کھانا پینا چھوڑ بیٹھی۔ اُسے یہ محسوس ہوتا کہ سُرِندر بھوکا پیاسا کہیں مارا مارا پھر رہا ہے۔ جو آدمی گھر میں بھی کوئی منگوا کر کھانا نہیں جانتا۔ وہ کسی اجنبی سے۔ کسی غیر سے کس طرح کچھ مانگ سکتا ہے؟ مادھوی کے دل میں یہ بات نقش تھی کہ سُرِندر کے پاس کچھ خرید کر کھانے پینے کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ ساتھ ہی

بھیک مانگنے کا ہنر بھی نہیں ہے۔ اِس لئے شاید وہ بچّے کی مانند بھوکا پیاسا ابتر حالت میں کسی سڑک پر پیڑی کے کنارے بیٹھا رو رہا ہوگا۔ یا کسی درخت کے سایہ تلے سرہانے کتابیں رکھ کر سو رہا ہوگا۔

برج بابو نے گھر لوٹ کر جب یہ حال سُنا تو مادھوی سے کہنے لگے۔ "کام تو یہ ٹھیک نہیں ہوا بیٹی"۔ مادھوی نے بڑی مشکل سے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کے سیلاب کو روکا۔

اِدھر سُریندر کا کیا حال ہے وُہ بھی سُنئے۔ تین دِن تو اُس نے بھوکے گھوم پھر کر بِتائے۔ پیسہ پاس نہ ہونے پر بھی نلکے کا پانی مُفت مِل سکتا ہے۔ اِسی سے جب بھوک شدّت اختیار کر لیتی تو جِدھر جاتا نلکا ملتا ہے پیٹ بھر پانی پی لیتا۔

ایک رات جب وُہ کالی گھاٹ کی طرف جا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں طاقت نہ تھی سارا جسم سُوکھ رہا تھا۔ پھر بھی وُہ ڈگمگاتے پاؤں سے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اُس نے کسی سے یہ سُنا تھا کہ وہاں کھانے کو ملتا ہے۔ ایک رات اندھیری تھی۔ اور اُس پر طرّہ یہ کہ گھنگھور گھٹائیں چھائی ہُوئی تھیں۔ چورنگی کے موڑ پر پہنچتے ہی اُس کے اُوپر ایک گاڑی آ پہنچی۔ خیریت یہ ہُوئی کہ گاڑی کے کوچوان نے کسی طرح جلدی سے راس کھینچ کر گھوڑوں کو روک لیا اور سُریندر کی جان بچ گئی۔ لیکن پھر بھی اُس کی چھاتی اور سینوں پہ گہری چوٹ لگی اور وُہ بے ہوش ہو گیا پولیس کے سپاہی نے اُسے ایک موٹر میں ڈال کر اسپتال پہنچا دیا۔ پانچ دِن بے ہوشی کی حالت میں پڑے رہنے کے بعد چھٹے دِن رات کو آنکھیں کھولتے ہی پہلے اُس کے مُنہ سے یہی نکلا ——— "بڑی دیدی"!

میڈیکل کا ایک طالب علم اُس رات کو اسپتال میں ڈیوٹی پر تھا۔ یہ الفاظ سُنتے ہی وُہ اس کے پاس آ گیا۔ اُس سے سُریندر نے پُوچھا۔ "بڑی دیدی آئی ہیں کیا ———؟"

جواب ——— "بڑی دیدی کل صُبح آویں گی ———"

دوسرے دِن سُریندر اچھی حالت میں رہا۔ لیکن بڑی دیدی کے بارے میں کچھ نہ پُوچھا وُہ دِن بھر تیز بخار میں پڑا تڑپتا رہا۔ شام ہونے پر ایک آدمی سے پُوچھا "کیوں جی کیا میں اسپتال میں ہُوں ——— ؟"

"جی ہاں ——— !"

"کیوں ——— ؟"

"آپ ایک گاڑی کے نیچے آ گئے تھے ——— "

"بھلا میرے بچ جانے کی اُمید ہے ——— ؟"

"جی۔ پُوری اُمید ہے ——— "

دُوسرے دِن میڈیکل کالج کے اُسی طالب علم نے جس سے پہلے دِن بات چیت ہُوئی تھی پاس آکر پُوچھا ——— "یہاں آپ کی جان پہچان کا کوئی بھی کوئی آدمی ہے ——— ؟"

سُریندر ——— "نہیں۔ کوئی نہیں۔"

طالب علم ——— "پھر اُس دِن آپ کس کو پُکار رہے تھے۔ کیا وُہ یہیں کہیں رہتی ہیں۔"

سُریندر ——— "رہتی تو ضرور ہیں۔ لیکن وُہ یہاں نہیں آ سکتیں۔ خیر۔ کیا آپ میرے پتا جی کو میری خبر پہنچا سکتے ہیں ——— ؟"

طالب علم ——— "جی کیوں نہیں ؟"

سُریندر نے پتا کا پتہ بتلا دیا۔ اُس نوجوان نے اُسی دِن خط لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا۔ اِس کے بعد بڑی دیدی کا پتہ ٹھکانہ معلوم کرنے کی غرض سے اُس نے پھر پُوچھا "یہاں عورتیں بھی آ سکتی ہیں۔ ہم پردہ نشین عورتوں کے لئے علیحدہ انتظام کر دیتے ہیں۔ آپ کی بڑی بہن کا پتہ معلوم ہو جائے تو مَیں اُن کو بھی اطلاع دے سکتا ہُوں۔"

سُریندر نے دَم بھر سوچ کر برج بابُو کا پتہ ٹھکانہ بتا دیا۔

طالبِ علم ــــ "میرا گھر برج بابو کے گھر کے قریب ہی ہے۔ میں آج ہی اُنہیں آپ کی حالت سے مُطلع کر دُوں گا۔ اگر وُہ چاہیں گی تو دیکھنے آجاویں گی"۔

سُرندر خاموش رہا۔ وُہ جانتا تھا کہ بڑی دیدی کا یہاں آنا قطعی ناممکن ہے۔ اُس طالبِ علم نے ترس کھاکر برج بابو کو اُسی وقت خبر کر دی۔ برج بابو یہ سُن کر چونک اٹھے۔ اُنھوں نے گھبراکر پُوچھا۔ "وُہ بچ تو جائے گا نا؟"

طالبِ علم ــــ "یہ اَمر تو یقینی ہے کہ وُہ خطرہ سے باہر ہیں"۔

برج بابو نے اندر جاکر مادھوی سے کہا۔ "بیٹی میں جو سوچ رہا تھا وُہی ہُوا۔ سُرندر گاڑی کے نیچے کُچلا گیا ہے۔ اِس وقت اسپتال میں پڑا ہے"۔

یہ سُنتے ہی مادھوی سَر سے پاؤں تک کانپ اُٹھی۔ برج بابو کہنے لگے۔

"سُنا ہے کہ اُس نے ہوش میں آتے ہی بڑی دیدی کہہ کر پکارا تھا۔ کیا تم اُسے دیکھنے نہیں جاؤ گی؟"

اِسی لمحہ ساتھ والے کمرے میں پرمیلا نے نہ جانے کیا گرا دیا۔ اُس کی آواز سُن مادھوی اُدھر دَوڑی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آکر اُس نے پِتا سے کہا۔ "تم دیکھ آؤ باپو جی میں وَہاں نہ جاؤں گی"۔

برج بابو نے دُکھی ہو کر کچھ مُسکراتے ہُوئے کہا۔ "وُہ تو بالکل جنگلی جانور ہے۔ اُس پر غصہ کرنا بھی بالکل بیکار ہے"۔

مادھوی کچھ نہ بولی۔ برج بابو اکیلے ہی سُرندر کو دیکھنے چلے گئے۔ اُس کی حالت دیکھ کر اُنہیں بڑا رنج ہُوا۔ اُنھوں نے کہا۔ "اچھا ہو اگر تُمھارے والدین کو خبر کر دی جائے تُمھاری کیا مرضی ہے"۔

سُرندر ــــ "وہاں خبر بھیج دی گئی ہے"۔

برج بابو ــــ "اب کچھ ڈر کی بات نہیں ہے۔ گھبرانا مت۔ جلد ہی اچھے

ہو جاؤ گے۔ تمہاری ماں کے آتے ہی مَیں تمہیں یہاں سے چلنے کا بندوبست کروں گا۔"

گھر آکر برج بابو نے مادھوی کو سارا ماجرا سنایا۔

اُسی دن سے ہر روز بلا ناغہ برج بابو دن میں ایک بار سُریندر کو دیکھنے جانے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ وُہ سُریندر سے کچھ لگاؤ سا محسوس کرنے لگے تھے۔ ایک دن اسپتال سے لوٹ کر اُنھوں نے مادھوی سے کہا ——— "مادھوی تیرا اندازہ تو ٹھیک نکلا۔ سُریندر کے پتا تو بڑے امیر آدمی ہیں۔"

مادھوی نے پوچھا ——— "آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا بابوجی؟"

برج بابو ——— "اُس کے پتا ایک نامی وکیل ہیں۔ وُہ کل رات آگئے ہیں۔"

مادھوی چپ ہو گئی۔ پتا نے پھر کہا ——— "سُریندر اپنے گھر سے بھاگ کر یہاں آیا تھا۔"

مادھوی ——— "ایسا کیوں؟"

برج بابو ——— "اُس کے پتا سے آج میری بات چیت ہوئی تھی۔ اُنھوں نے سارا حال سُنایا۔ اُس نے اِسی سال الہ آباد یونیورسٹی سے آنرز کے ساتھ ایم۔اے پاس کیا ہے۔ اِس کے بعد اُس نے ولایت جاکر تعلیم حاصل کر کے ڈگری لینے کی خواہش ظاہر کی تو پتا اور سوتیلی ماں دونوں نے مخالفت کی۔ بس اِسی سے وُہ ناراض ہو کر گھر سے بھاگ کر کھڑا ہُوا۔ پتا کا اِرادہ ہے ٹھیک ہوتے ہی وُہ لڑکے کو گھر لے جائیں گے۔"

اُبھرتی ہُوئی سانسوں کو دَبا کر اور اُمڈتے ہُوئے آنسوؤں کو پی کر مادھوی نے کہا۔ "یہی اچھا ہو گا بابوجی ——— ۔"

۵۔ آپ ہی نے درد بخشا تھا ہمیں
دیکھئے اب آپ ہی گھبرا گئے

سُرنیدر کو کلکتہ سے اپنے گھر گئے چھ مہینے ہو گئے۔ اِس دوران مادھوی نے اپنی سہیلی منورما کو فقط ایک ہی خط لکھا تھا۔

دُرگا پُوجا کے مُبارک موقع پر منورما میکے آئی۔ آتے ہی مادھوری کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی۔

بولی ——— "اپنا وہ بندر تو دِکھا ——— ؟"

مادھوی نے ہنس کر جواب دیا۔ "بندر کہاں سے لاؤں ری ——— ؟"

منورما نے مادھوی کی ٹھوڑی ہلا کر کہا ——— "میں یہی دیکھنے تو دوڑی آئی ہوں کہ اِن مُقدس قدموں کے پاس رہنے والا تقدیر کا سِکندر بندر کیسا ہے۔ وُہی جسے تُو نے پال رکھا تھا۔؟"

مادھوی ——— کب پالا تمہاری ——— ؟

منورما نے ازراہِ مذاق لہجے میں کہا ——— "کیا یاد نہیں ہے؟ ارے وُہی جو تیرے سوا کسی اور کو جانتا ہی نہ تھا ——— "

منورما کا مقصد پہلے ہی سمجھ چکی تھی۔ اِسی سے اُس کے چہرے کی رنگت بدلتی جا رہی تھی۔ پھر بھی خُود کو سنبھال کر بولی ——— "اوہ! ماسٹر صاحب کو پُوچھتی ہے وُہ تو خُود ہی چلے گئے۔"

"ایسے مُقدس قدم بھی اُسے پسند نہیں آئے ——— "

مادھوی نے دُوسری طرف مُنہ پھیر لیا کچھ بولی نہیں۔ منورما نے پیار اور

محبت کے ساتھ ہاتھ سے سہیلی کا منہ اپنی طرف کیا۔ اُس نے دیکھا۔ اُس کی دِل لگی سے سہیلی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔ حیران ہو کر پوچھا ——— "مادھوی یہ کیا ———؟"

اب اور ازیادہ اپنے آپ کو سنبھالنا مادھوی کے لئے ناممکن سا ہو گیا۔ وُہ آنکھوں سے آنچل لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

منورما کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ سہیلی کو تسلّی و تشفی دینے کے لئے اُسے لفظ ہی نہ سوجھ پڑا۔ اُس نے کچھ دیر مادھوی کو رونے دیا۔ اِس کے بعد زبردستی مُنہ پر سے آنچل کھینچ کر نہایت غمگین ہو کر کہا ——— "تم تو معمُولی سی دِل لگی ہی میں رونے لگیں بہن۔ مَیں نہ جانتی تھی کہ اِتنی سی دِل لگی بھی نہ سہہ سکو گی ———"

مادھوی نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا ——— "مَیں بیوہ ہُوں جو بہن ———"

اِس کے بعد دونوں خاموش رہیں۔ دونوں سہیلیاں دِل ہی دِل میں رو رہی تھیں منورما رو تی تھی مادھوری کے دُکھ سے اُس کی بیوگی کے غم کو محسُوس کر کے۔ لیکن مادھوی کیوں رو رہی تھی ؟ اِس کے رونے کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ اِس وقت بغیر سوچے سمجھے منورما نے جو مذاق کیا کہ "وُہ تیرے سوا کسی اَور کو نہیں جانتا تھا"۔ وُہی مادھوی کے دِل کو مسلے جا رہا تھا۔ مادھوی خُوب اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ بات سولہ آنے صحیح ہے۔ بہت دیر کے بعد منورما بولی ——— "لیکن کام تو یہ اچھا نہیں ہُوا بہن ———"

مادھوی ——— "کون سا کام ———"

منورما ——— "یہ بھی بتانے کی ضرُورت ہے کیا؟ میں سب کچھ سمجھ گئی ہُوں۔"

اتنے دِنوں سے۔ لگ بھگ چھ مہینوں سے۔ جس بات کو۔ جس بڑے راز کو مادھوی جی جان سے چھپائے ہُوئے تھی۔ اُسے آج منورما سے چھپانا مشکل ہو گیا۔ چھپانے میں ناکام ہونے سے پکڑی جانے پر مادھوی آنچل میں منہ چھپا کر بلک بلک کر رونے لگی۔ بچّہ کی مانند پھوٹ پھوٹ کر۔

آخر ہیں منورما نے کہا ——— "لیکن یہ تو بتا۔ وہ چلا کیوں گیا آخر ——— ؟"

مادھوی ——— "میں نے ہی اُسے چلے جانے کو کہا تھا ———"

منورما ——— "بہت خوب کیا عقلمندی کا ثبوت دیا تم نے ———"

مادھوی نے دیکھا کہ حقیقت منورما کچھ بھی نہ سمجھ پائی۔ یہ جان کر منورما کو شروع سے آخیر تک تمام باتیں سمجھا دیں۔ اس کے بعد کہا ——— "لیکن یہاں اگر ماسٹر صاحب نہ پہنچتے تو مَیں پاگل ہو جاتی ———"

منورما نے اپنے دِل میں کہا۔ "اِس وقت بھی پاگل ہونے میں کیا کسر ہے۔"

اُس دِن بہت ہی رنجیدہ اور غمگین ہو کر منورما اپنے گھر لوٹ آئی۔ اسی دِن رات کے وقت کاغذ قلم لے کر منورما اپنے شوہر کو خط لکھنے بیٹھی۔ خط میں لکھا:۔

"تم ٹھیک ہی کہتے تھے کہ عورت ذات کا کچھ بھروسہ نہیں۔ میں بھی آج اِسی کو دوہراتی ہوں۔ کیونکہ آج مادھوی نے مجھے یہ تعلیم دی ہے۔ میں اُسے بچپن سے جانتی ہوں۔ وہ میرے ساتھ کھیلی پڑھی ہے۔ مَیں اُس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اِسی لئے اُسے مجرم نہیں کہہ پاتی۔ ایسا کہنے کہ ہمت نہیں پڑتی کہ عورت ذات پر الزام لگاؤں۔ مَیں تو پرماتما کو ہی مجرم ٹھہراؤں گی۔ اُس نے کیوں عورت کے دِل کو اِتنا نرم بنایا ہے عورت کے دِل کو اُس نے ایسی نرم شے سے کیوں بنایا ہے؟ بھگوان نے عورت کے سادہ دِل کو اِتنا زیادہ پیار اور محبت سے کیوں لبالب بھر دیا ہے۔ کس نے ایسا کرنے کو کہا تھا؟ اُس نٹ ناگر کے حضور میں میری یہ التجا ہے کہ آئندہ عورت کے دِل کو ذرا زوردار اور سخت بنایا کرے۔ اور تم سے میری یہ درخواست ہے کہ میں اِنہیں قابلِ احترام قدموں میں سر رکھ کر بڑی مسرت پیار اور محبت سے تمہیں دیکھتے ہوئے مرنے کا فخر حاصل کر سکوں مادھوی کو دیکھنے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ اُس نے میرے زندگی بھر کے عقیدہ اور اعتماد کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔ بیچ مانو میرا بھی بھروسہ نہ کرنا۔ جلدی ہی آکر اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

جس وقت منورما کے شوہر نے یہ خط پایا۔ اُسی وقت اُس کے جواب میں یہ لکھ بھیجا

"جس کا جو رُوپ ہے وُہ اُسے آشکار کرے گا ہی۔ جس میں جو اوصاف ہیں۔ وُہ اُنھیں ظاہر کرے گا ہی۔ جس کے دِل میں پیار ہے وُہ پیار کرے گا ہی۔ مادھوی تابیل کے مانند درخت کا سہارا لیتی ہے۔ اُس سے لپٹتی ہے۔ یہی دُنیا کی چال ہے۔ یہی زمانہ کی ریت ہے۔ جس کے لئے تم باتیں کر رہی ہو کیا کر سکتے ہیں۔ باقی تم فکر نہیں کرو۔ مجھے تم پر پُورا بھروسہ اور اعتماد ہے"۔

منورما نے شوہر کا خط پڑھ کر آنکھوں سے لگایا۔ اور قابلِ پرستش شوہر کے پاؤں میں تصور میں ہی سر جھکا کر جواب میں لکھ دیا۔

"مادھوی خاندان کے پُر نُور ماتھے پر ایک بدنُما داغ ہے۔ ایک بیوہ کو جو نہ کرنا چاہیئے وُہی اُس نے کیا۔ وُہ دِل ہی دِل میں ایک غیر آدمی سے پیار کرتی ہے"۔

یہ خط پڑھ کر منورما کا پتی دِل ہی دِل میں خُوب ہنسا۔ پھر اُس نے مذاق ہی مذاق میں یہ لکھ دیا۔

"مادھوی کے ایک بدنُما داغ ہونے میں کچھ شُبہ نہیں؟ بیشک وُہ خاندان کے پُر نُور ماتھے پر ایک بدنُما داغ ہے۔ کیونکہ بیوہ ہوتے ہُوئے بھی وُہ ایک غیر آدمی کو چاہنے لگی ہے۔ تم لوگوں کے ناراض ہونے کی بات ہی ہے۔ کہ بیوہ ہوتے ہُوئے بھی تم سُہاگنوں کے حقوق میں ہاتھ کیُوں ڈالے۔ لیکن جب تک میں زندہ ہُوں تمھیں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بہت اچھا موقعہ ہے۔ موقعہ سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھا کر ایک اور آدمی کو دِل ہی دِل میں پیار کر ڈالو۔ سچ پُوچھو تو یہ نئی خبر سُنا کر تم مجھے حیرت میں نہیں ڈال سکی منورما۔ میں نے ایک جگہ لتا دیکھی ہے۔ وُہ ایک میل تک زمین پر پھیلتی اور بڑھتی ہُوئی آخر میں جا کر ایک درخت سے لپٹ کر اُس کے اُوپر چڑھ گئی ہے۔ اِس وقت وُہ کتنے ہی پتوں، پھلوں اور پھُولوں سے لدی ہُوئی ہے۔ جب تم یہاں آؤ گی تو اکٹھے چل کر

اُسے دیکھ آدیں گے"۔

منورما نے لکھیا کر اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اِدھر مادھوی دِن بدِن دُبلی پتلی اور زرد سی ہوتی جا رہی تھی آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ اُسکا شگفتہ چہرہ مُرجھا گیا تھا۔ روزانہ کے کام کاج میں وہ ہوشیاری نہ جوش اور وہ پھرتی نہ رہی۔ کچھ کچھ کاہلی اور سُستی نے آدبوچا تھا۔ سب کی خبر رکھنے۔ سب کی عزت اور خدمت سے مطمئن اور خوش دیکھنے کی تمنا تو ویسی ہی تھی۔ بلکہ اور زیادہ ہو گئی تھی۔ لیکن کام کاج کرنے میں اکثر بھول چوک ہو ہی جاتی تھی۔ پہلے جیسے مادھوی کبھی بھی کام میں گڑبڑ نہ ہونے دیتی تھی اور ہر وقت ہر کام کرنے کی یاد رکھتی تھی۔ اب وہ بات نہ رہی۔ اکثر بھول جایا کرتی۔ خیال ہی نہ رہتا۔

ویسے تک سبھی اُسے بڑی عزت سے بڑی دیدی کہتے ہیں۔ اب بھی سبھی پناہ گزیں لوگ اُسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اُسی کا مُنہ تاکتے ہیں۔ اور مقصود ثمر پاتے ہیں۔ لیکن اب ہری بھری لتا اب پہلے کے مانند شگفتہ اور تر و تازہ نہیں رہی۔ جہاندیدہ لوگوں کے دل میں کبھی کبھی یہ خیال اُٹھتا ہے کہ کہیں یہ لتا مُرجھا کر سوکھ نہ جائے؟

منورما اب بھی روزانہ آتی ہے۔ اور کئی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن وہی ماسٹر کی چرچا کبھی نہیں ہوتی۔ مادھوی کو اِس سے رنج ہوتا ہے اور یہ بات منورما سے چھپی بھی نہیں رہتی۔ وہ سوچتی ہے۔ اب اِس مسئلہ پہ بات چیت نہ کرنا ہی بہتر ہوگا۔ منورما یہ بھی سوچتی کہ یہ بد نصیب اگر اِسی طرح اُسے بھول جائے تو اچھا ہے۔

کچھ تندرست ہونے پر سُریندر پتا کے ہمراہ گھر واپس چلا گیا۔ اب سوتیلی ماں اُس کی دیکھ بھال کچھ کچھ کرنے لگی تھی۔ اِسی سے سُریندر کے جسم میں قدرے طاقت آنے لگی لیکن طبیعت اچھی طرح ٹھیک نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دِل میں ایک کانٹا کھٹکتا رہتا جس کی خلش بہت تکلیف دہ ہوتی۔ حُسن اور جوانی کی تمنا اور شرارت کی خواہش ابھی تک اُس

کے دِل میں پیدا نہ ہُوئی تھی۔ اِن باتوں کا خیال ہی اُسے نہ آتا۔ پہلے کے مانند وُہ اَب بھی نکما رہتا۔ کام میں لگن پیدا نہ کر سکا۔ کسی کے بھروسے رہنا چاہیئے۔ کون اُس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے خوشی سے تیار ہو سکے گا۔ یہ وُہ ابھی تک نہ جان پایا تھا۔ سمجھ نہ پڑنے پر لاچار ہو کر اپنا کام خود ہی کر لینے والا وُہ نہ تھا۔ اِسی لیے وُہ دوسروں کا مُنہ دیکھتا رہتا فرق صرف یہ پڑ گیا کہ اَب پہلے کے مانند اُسے بے دِلی سے کیا گیا کام پسند نہ آتا۔ سبھی کاموں میں اُسے کچھ کچھ خامی دِکھائی دیتی۔ اُس کی سوتیلی ماں یہ سب دیکھ کر کبھی کبھی کہہ اُٹھتی۔ "سُریندر جیسے آج کل بدل سا گیا ہے۔"

اِسی دوران ایک روز سُریندر کو بُخار چڑھ گیا۔ بڑی تکلیف ہُوئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سوتیلی ماں قریب ہی بیٹھی تھی۔ اُس نے ایک نئی بات دیکھی۔ اُسی وقت اُس کی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔ پیار سے لڑکے کے آنسو پُونچھتے ہُوئے کہنے لگی ——— "بیٹا سُریندر کیا بات ہے! سُریندر چُپ رہا۔ اس کے بعد اُس نے ایک پوسٹ کارڈ مانگا اور اُس پڑھے لکھے حروف میں لکھ دیا ——— "بڑی دیدی مجھے بُخار چڑھ گیا ہے۔ بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔"

لیکن وُہ خط ڈاک خانہ تک نہ پہنچ سکا۔ پہلے پلنگ سے فرش پر گرا۔ اور وہاں سے جھاڑو دیتے وقت نوکر نے سیب کے چھلکے۔ بسکٹ کے ٹکڑوں۔ انگور کے پٹارے کی رُدی اُسی طرح کے اور کوڑے کرکٹ کے ساتھ وُہ خط باہر پھینک دیا۔ اِس طرح سے سُریندر کے دِل کی حسرت مٹی میں مِل کر، ہَوا میں اُڑ کر، شبنم میں بھیگ کر اور دھوپ میں سُوکھ کر انجام کار بُبول کے درخت کے نیچے آ کر پڑی رہی۔

پہلے تو سُریندر کو اُمید تھی کہ خط کے جواب میں لازمی طور پر بڑی دیدی کے درشن ہونگے لیکن اِس کے بعد بڑی دیدی کے ہاتھ کے لکھے ایک کاغذ کے ٹکڑے لیے ہی ترستا رہا۔ کئی دِن بیت گئے۔ مگر کوئی جواب نہ آیا۔ کوئی بھی تمنا یا اُمید بر نہ آئی۔ دھیرے دھیرے

بخار کی شدت کم ہوتی گئی۔ اور کچھ دنوں بعد صحتیاب ہو کر اُٹھ کھڑا ہُوا! اس کے بعد سُریندر کی زندگی میں ایک نیا سانحہ واقع ہُوا۔ سانحہ گویا بالکل نیا تھا۔ لیکن تھا بالکل قدرتی۔ سُریندر کے والد کو اِس کی اِطلاع بہت دِنوں سے تھی۔ اور اِس کے ہونے کی اُمید بھی لگائے بیٹھے تھے۔ سُریندر کے نانا پُونا ضلع کے ایک متمول زمیندار تھے۔ اِن کی زمینداری میں پچیس گاؤں کی تھی۔ سالانہ آمدنی چالیس پچاس ہزار روپے کے لگ بھگ تھی۔ لیکن اُن کے کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ اِس لئے خرچ کا کم ہونا تو قدرتی اَمر تھا۔

علاوہ ازیں وُہ بڑے کنجُوس بھی تھے۔ اِسی سبب اپنی طویل زندگی میں اُنھوں نے اچھی خاصی رقم جمع کر لی تھی۔ اُن کی وفات پر اُن کی ساری دَولت اور جائیداد اُنکے دوہتے سُریندر کو ہی مِلنے والی تھی۔ وُہی اُن کا حق دار تھا۔ سُریندر کے پِتا کو اِس کی پُوری پُوری اُمید تھی۔ ہُوا بھی وُہی۔ سُریندر کے پِتا رائے باجو کو خبر ملی کہ اُن کے سُسر آخری دَموں پر ہیں۔ اِس لئے وہ فوراً ہی بیٹے کو ہمراہ لے کر چل پڑے۔ لیکن اُن کے پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ سُسر جی کچھ دیر پہلے ہی کُوچ کر چُکے تھے۔

بڑی دھوم دھام کے ساتھ سُسر کی تیرھویں ہو گئی۔ زمینداری کا بندوبست ہوشیار داماد نے اپنے ہاتھوں میں آتے ہی اور بھی ٹھیک ٹھکانے سے دیکھنا بھالنا اور سمجھنا شروع کر دیا۔ تُند مزاج، عقلمند، جہاندیدہ، اور ہوشیار وکیل رائے باجو کی کڑی نگرانی سے پریشان ہو کر علاقہ کے سارے لوگ بھڑک اُٹھے۔

رائے باجو کو اَب سُریندر کی شادی کا خیال پیدا ہُوا۔ لڑکی لڑکوں کا پتہ لگانے والے دلال گھٹک کہلاتے ہیں۔ اُتر پردیش، مدھیہ پردیش وغیرہ میں یہی کام نائی یا پروہت کیا کرتے ہیں۔ خبر پاکر رائے باجو کے گھر بھی آنے جانے لگے۔ گاؤں بھر میں دھوم مچ گئی۔ چالیس پچاس کوس تک کی حد کے اندر جہاں کوئی خوبصورت لڑکی تھی وہاں اُس لڑکی کے لئے خوبصورت نوجوان تعلیم یافتہ ورسُریندر ناتھ سے رشتہ کی اُمید کے ساتھ گھٹک پہنچ جاتے۔

اسی طرح دو چار مہینے گذر گئے۔

آخر ایک دِن سُریندر کی سوتیلی ماں نے ایک رشتہ منظور کر لیا۔ مہمان آ کر اکھٹے ہونے لگے۔ رشتہ داروں اور دوستوں سے سارا گھر بھر گیا۔

اس کے بعد ایک دِن صبح کے وقت ڈھول تاشے وغیرہ باجوں کی آواز اور باراتیوں اور تماشائیوں کے شور و غُل اور چہل پہل سے سارا گاؤں گونج اُٹھا۔ سُریندر ناتھ شادی کر کے گھر لوٹ آیا۔

لگ بھگ پانچ سال بیت گئے، اب نہ سُریندر کے پیارے بابو ہی اس دُنیا میں موجود ہیں اور نہ مادھوی کے پتا برج بابو ہی زندہ ہیں۔ سُریندر کی سوتیلی ماں اپنے شوہر کی ساری جائداد لے کر اپنے میکے بیٹھ گئی ہے۔

آج کل سُریندر ناتھ کی جیسے تعریف ہوتی ہے، ویسے ہی بُرائی بھی ہوتی ہے۔ ایک پارٹی کے لوگ کہتے ہیں کہ ایسا شریف، مہربان، رحمدل اور بے خطر دوستوں کی عزت کرنے والا زمیندار دُنیا بھر میں دوسرا دِکھائی نہیں دیتا۔ اس کے خلاف مخالف پارٹی کے لوگ کہتے ہیں کہ ایسا ستانے والا سخت زمیندار اس دُنیا میں پیدا ہی نہیں ہُوا۔

یہ دونوں بیان صحیح ہیں۔ پہلی بات تو خود سُریندر ناتھ کے سبب سچ ہے۔ اور دُوسری بات اُس کے مینجر متھرا ناتھ کی وجہ سے سچ ہے۔

سُریندر کی بیٹھک میں آج کل دوستوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ وہ لوگ بڑے سکھ اور آرام کے ساتھ دُنیا کے سبھی شوق پورے کرتے ہیں۔ پان، تمباکو، گوشت، شراب اور دیگر

لوازمات ہمیشہ سبھی کے لئے حاضر رہتی ہیں۔ دوستوں کو کسی چیز کے لئے بھی متفکر نہیں ہونا پڑتا خود ہی سب کچھ حاضر ہو جاتا ہے۔

مینجر متھرا بابو اِس میں خوب جوش و خروش دکھاتے۔ خرچ کرنے میں وُہ کبھی نہیں ہچکچاتے۔ دعوتوں اور جلسوں کے خرچ کے لئے وُہ دِل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ اُن کا ایسا رعب ہے کہ رعایا خود خوشی سے اِس کا سارا خرچ چلاتی ہے۔ متھرا بابو کے حساب کی ایک پائی بھی کسی پر بقایا نہیں رہ سکتی۔ رعایا کے گھروں میں آگ لگوانے میں لوگوں کے بسے بسائے گھروں کو اُجاڑنے میں۔ زمیندار کے دفتر میں ایک چھوٹی سی کال کوٹھری میں قرضدار کسانوں کو قید کرنے اور مارتے مارتے اُدھ مُوا کر ڈالنے میں جو ہمت وُہ دِکھاتے ہیں اُس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

رعایا کی چیخ و پکار کبھی کبھی شانتی دیوی (سُریندر ناتھ کی بیوی) کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ وُہ مالک سے تنبیہ کے طور پر کہتی ہے ——— "اگر تم اپنی زمینداری کی دیکھ بھال خود نہ کروگے تو سب ستیاناس ہو جائے گا ———"

سُریندر چونک کر کہتا ہے ——— "کیوں ——— ایسی کیا بات ہے؟"

شانتی دیوی ——— "کیا تم نہیں کہ گاؤں بھر میں ہمارے علاقے میں بُرائی ہو رہی ہے۔ فقط تم تک ہی یہ باتیں نہیں پہنچ پاتیں۔ جو بتیس گھنٹے دوستوں کو لئے بیٹھے رہنے سے کہیں کوئی باتیں سُن پاتا ہے۔ ایسے جابر منتظم کا کوئی کام نہیں اُسے اُبھی جواب دے دیجئے ———"

سُریندر دُکھی ہو کر کہتا ہے ——— "ٹھیک ہے۔ میں کل سے ہی خود ہی سب کام دیکھوں گا ———"

اس کے بعد کچھ دن تک زمینداری کے کام کی دُھوم مچ جاتی ہے۔ مینجر صاحب گھبرا اُٹھتے ہیں۔ کبھی کبھی سنجیدگی سے کہتے ہیں "بابو جی اِس طرح انتظام میں نرمی کرنے سے بھلا

زمینداری کیسے سنبھل سکے گی۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ سختی سے کام لیے بنا آپ اپنی زمینداری قائم رکھ سکیں گے؟ کبھی نہیں۔ ناممکن ہے۔

سُرینیدر ہنس کر کہتا ہے۔ ـــــ "غریب، نادار اور دُکھیوں کا خُون چُوس کر جو زمینداری قائم ہے۔ اُس زمینداری کو بنائے رکھنے سے کیا ہوگا! ایسی ظالم اور خونخوار زمینداری کس کام کی متھرا بابو؟"

متھرا بابو ـــــ "تو پھر مجھے اجازت دیجیئے میں چلا جاؤں؟"

یہ سُنتے ہی سُرینیدر نرم پڑ جاتا ہے۔ پھر اِس کے بعد ویسے کا ویسا ہی چکّر چلنے لگ جاتا ہے۔ سُرینیدر پہ معمُول کے مُطابق بیٹھک خانہ میں دوست یاروں کی خاطر مدارات میں لگ جاتا ہے۔ اور پھر چھ چھ دن تک بیٹھک میں ہی پڑا رہتا۔

ابھی حال ہی میں ایک اور نئی مُصیبت اُس کے گلے پڑ گئی ہے۔ ابھی جو نیا باغ معہ بارہ دری کے تیار ہُوا ہے اِس میں ایک ایلوکیشی نام کی عورت نے کلکتہ سے آکر ڈیرہ ڈال لیا ہے۔ اُسے ناچنے اور گانے میں کمال حاصل ہے۔ دیکھنے میں بھی اچھی خاصی ہے۔ چھتہ ٹوٹ جانے پر جیسے شہد کی مکھیوں کے گروہ جیسے دل کے دل ایک جگہ سے دوسری جگہ کے لیئے چل پڑتے ہیں۔ ویسے ہی اب دوستوں کا دل یاروں کا گروہ اب بیٹھک کو چھوڑ کر اسی طرف جانے لگا ہے۔ دوستوں کو اتنی خوشی ہے کہ وہ اُسے روک نہیں پاتے۔ سُرینیدر کو بھی وہ سب اُدھر لے جاتے ہیں۔ آج تین دن گذر گئے شانتی کو شوہر کے درشن ہُوئے۔ شوہر کو دیکھ کر وہ پیٹھ کر کے دروازے کے سہارے کھڑی ہو کر پُوچھنے لگی ـــــ "اتنے دن آپ کہاں رہے ـــــ؟"

سُرینیدر ـــــ "باغ کی بارہ دری میں ـــــ"

شانتی ـــــ "وہاں ایسی کون سی دلچسپی ہے جو تُم تین دن تک وہاں رہے؟"

سُرینیدر ـــــ "ہاں! یہ تو ـــــ ـــــ؟"

شانتی ـــــ "ہر بات میں بس اِسی طرح کہہ دیتے ہو۔ میں سب کچھ سُن چکی ہُوں" کہتے کہتے شانتی پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ پھر کہنے لگی ـــــ "مجھ سے ایسا کون سا گناہ ہُوا ہے جو اِس طرح ٹھکرا رہے ہو ـــــــ؟"

سُریندر ـــــ "کہاں۔ ایسا تو میں نے ـــــــ"

شانتی قطع کلام کرتے ہوئے ـــــ "اور کیسے ٹھُکرانا کسے کہتے ہیں۔ عورت کی بے عزّتی اِس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے ـــــ؟"

سُریندر ـــــ "ہاں ہاں۔ تو ٹھیک ہے۔ مگر وہی سب لوگ ـــــ"

شانتی نے کچھ نہیں سُنا اور بھی زیادہ زور سے بلک بلک کر رونے لگی۔ پھر بولی "تم سوامی ہو۔ میرے بھگوان ہو۔ میرا یہ لوک اور پرلوک سب کچھ تم ہی ہو۔ میں کیا تم کو پہچانتی نہیں۔ مَیں جانتی ہُوں۔ میں تمہاری کچھ نہیں ہُوں۔ میں ایک دِن بھی تمہارے دِل کو نہیں بہلا سکی۔ اپنا دُکھ میں کیسے بتاؤں۔ تم شرمندہ نہ ہو۔ تم دُکھی نہ ہو۔ یہ سوچ کر اپنے دِل کی بات ـــ رُوح کی گرانبہا تمہیں ابھی نہیں بتاتی ـــــ"

سُریندر ـــــ "تم روتی کیوں ہو شانتی ـــ؟"

شانتی ـــــ "روتی کیوں ہُوں۔ کیا جواب دُوں۔ کیوں روتی ہُوں اسے ایشور ہی جانتا ہے میں کیوں روتی ہُوں۔ میں یہ بھی سمجھتی ہُوں۔ کچھ مجھ سے چھپا نہیں ہے کہ تم میری بے عزّتی نہیں کرتے۔ تمہارے دِل میں بھی دُکھ ہے۔ تم کیا کرو (آنسو پونچھ کر) میں بھلے ہی زندگی بھر انگاروں پر لوٹوں کوئی حرج نہیں۔ لیکن تم کو دُکھ ہے کیا تکلیف ہے۔ کاش مجھے معلوم ہو سکے ....تو ـــ ....؟"

سُریندر نے اُسے اپنے پاس کھینچ کر اپنے ہاتھوں سے اُس کے بہتے ہوئے آنسو پونچھ کر۔ پیار سے بڑے میٹھے لہجے میں کہا ـــ "تو پھر میں کیا کروں شانتی ـــ؟"

شانتی ـــــ "آپ کو اِس سوال کا بھلا کیا جواب دیا جا سکتا ہے۔ اِس کا

تو کچھ جواب ہی نہیں سُوجھ پڑتا۔" شانتی پھر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

بہت دیر کے بعد شانتی نے کہا ——— "تمھاری صحت بھی تو آج کل اچھی دکھائی نہیں دیتی ———"

سُریندر ——— "آج کیوں پچھلے پانچ سالوں سے ہی اچھی نہیں ہے۔ جس دن کلکتہ کے میدان میں گاڑی کے نیچے کُچلا گیا تھا۔ چھاتی میں، پیٹھ میں، ہڈیوں میں گہری چوٹیں آئی تھیں۔ مہینے بھر اسپتال میں پڑا رہا۔ اُسی دن سے میری صحت ٹھیک نہیں ہے۔ اُس دن کی چوٹ اور تکلیف کسی طرح بھی دور نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی خود مجھے بھی یہ سوچ کر تعجب ہوتے لگتا ہے کہ میں اب تک زندہ کیسے ہوں ———"

شانتی نے شوہر کے سینے پر ہاتھ لگا کر کہا۔ "چلو گاؤں چھوڑ کر اب ہم لوگ کلکتہ چلیں۔ وہیں اچھے اور بڑے بڑے تجربہ کار ڈاکٹر رہتے ہیں۔"

سُریندر مسرت سے جھُوم اُٹھا کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے چلو۔ وہاں بڑی دیدی بھی ہے ———"

شانتی ——— "بڑی دیدی کو دیکھنے کی تو مجھے بھی بڑی تمنا ہے۔ اُنہیں اپنے گھر لے آؤ گے نا؟"

"لاؤں گا کیوں نہیں؟" یہ کہہ کر ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا۔

"وہ ضرور آ دیں گی۔ مَیں مر رہا ہوں ——— یہ سُن پاویں ———"

شانتی نے درمیان میں ہی شوہر کا مُنہ بند کر دیا اور کہنے لگی ——— "تمھارے پاؤں پڑتی ہوں پھر ایسی بات مُنہ سے نہ نکالنا۔ آہ اگر وہ آجائیں تو میرے تمام دُکھ دُور ہو جائیں۔"

ایک اُنجان سے عقیدت کے جذبہ سے شانتی کا دِل بھر گیا۔ ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس نے کہا تھا کہ وہ شوہر کی دنی نہیں ہے۔ لیکن سُریندر نے اتنا نہیں سمجھا

اِس طرف اتنا خیال نہیں کیا۔ اِس پہلو کو اُس نے دھیان سے نہیں دیکھا۔ وہ تو جو کچھ کہہ رہا تھا اُسی میں مست تھا۔ اُس میں بڑا آنند ملتا تھا۔ وہ اُسی سلسلے میں کہتا گیا ——

"تم خود ہی جا کر بڑی ویدی کو بلا لانا شانتی۔ کیوں جاؤ گی نا ——"

شانتی نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

سُریندر —— "بڑی ویدی کے آتے ہی تم خود ہی دیکھ لینا مجھے کوئی دکھ نہ رہے گا۔"

شانتی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

دوسرے دِن شانتی نے خادمہ کے ذریعہ منیجر متھرا بابو کے پاس کہلا بھیجا کہ باغ میں جس کو لا کر ٹکایا گیا ہے اُسے ابھی اِسی وقت اگر بھگا نہ دیا گیا تو انہیں منیجری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اِدھر شوہر سے کہا —— "خیر چاہے جو کچھ ہو۔ لیکن اگر تم نے گھر کے باہر قدم بھی رکھا تو سر ٹپک ٹپک کر اپنی جان دے دوں گی۔"

سٹپٹایا ہوا سُریندر کہنے لگا —— "وہی تو۔ ہاں سو۔ مگر یہ لوگ سب ——"

شانتی —— "اچھا تو۔ "مگر یہ" کا بھی بندوبست کئے دیتی ہوں۔" کہہ کر شانتی نے خادمہ کو بُلا کر پھر حکم دیا —— "جا کر دروازے پر سپاہی سے کہہ دے کہ وہ سب لچے لفنگے اور بدمعاش میری چوکھٹ پر قدم نہ رکھنے پاویں۔"

منیجر بابو نے دیکھ لیا کہ اب معاملہ بگڑ گیا ہے۔ اِس لئے اُس نے فوراً ایلوکیشی کو بھگا دیا۔ دوستوں کی پارٹی بھی تتر بتر ہو گئی۔ اِس کے بعد منیجر بابو نئے سرے سے دِل لگا کر زمینداری کا کام دیکھنے لگے۔

سُریندر ناتھ کا ابھی کلکتہ جانا فی الحال رُک گیا۔ کلیجے کا درد بھی اب کچھ کچھ گھٹنے لگا تھا۔ کلکتہ جانے کے لئے شانتی بھی اب پہلے جیسی ضد نہ کرتی تھی۔ وہ یہیں رہ کر شوہر کی ہر ممکن خدمت کرنے لگی تھی۔ ایک مشہور و معروف تجربہ کار ڈاکٹر کو

کلکتہ سے بُلوا کر خاوند کو دکھلایا۔ ڈاکٹر نے سب دیکھ بھال کر ایک دوا تجویز کی، ساتھ ہی خاص طور سے احتیاط برتنے کی ہدایت کی کہ مریض کے کلیجے کی حالت سخت نازک ہے ایسی حالت میں سخت محنت کا کوئی بھی کام کرنا ٹھیک نہیں۔

اِدھر موقع کی نزاکت کو بھانپ کر منیجر نے جس ڈھنگ سے زمینداری کا کام شروع کر دیا تھا اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علاقہ بھر میں ہاہا کار مچ گئی۔ اسی دوران کبھی کبھی رعایا کی آہ و فریاد شانتی کے کانوں تک بھی پہنچ جاتی۔ لیکن ڈاکٹر کے حکم کا خیال کرتے ہوئے وہ شوہر سے کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ کر سکی۔

برج بابو کے ہاں اب برج بابو کی جگہ اُن کا بیٹا شیو چندر مالک ہے۔ گھر کا سارا انتظام مادھوی کے ہاتھوں سے نکل کر نئی بہو کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ بھائی (شیو چندر) آج بھی اُسی طرح خوب پیار و محبت اور عزت سے پیش آتا ہے۔ لیکن پھر بھی — جانے کیوں اب مادھوی کا دل یہاں بالکل نہیں لگتا۔ یہاں رہنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ گھر کے تمام نوکر چاکر، مُنیم وغیرہ سب اِس وقت بھی بڑی دیدی ہی کہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی سمجھتے ہیں کہ صندوق کی کنجی اب دوسرے ہی کے آنچل سے بندھی رہتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب اخذ نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ شیو چندر کی بیوی مادھوی سے بدتمیزی سے پیش آتی ہے۔ یہ کہنا نہیں مانتی۔ لیکن ہاں وہ ایک طرح کا جذبہ ہی ضرور ظاہر کرتی ہے جس سے مادھوی اچھی طرح سمجھتی رہتی ہے کہ اب اِس نئی نویلی بہو کے حکم اور صلاح لئے بغیر کوئی کام کرنا اُس کے لئے مناسب نہیں۔

تب پِتا کا زمانہ تھا۔ اَب بھائی کا وقت ہے۔ تب اور اَب میں تھوڑا سا تو فرق ہونا ہی چاہیئے۔ پہلے اُس کا خاص طور پر مان تھا۔ عزّت تھی۔ اُس کی ہٹ کا زمانہ تھا۔ لیکن اَب عزّت ہوتے ہوئے بھی ضد نہیں چلنے پائے گی۔ پِتا کے پیار اور دُلار سے وُہ اُن دِنوں سیاہ وسفید کی مالک تھی۔ لیکن اَب جیسے اور سب گھر کے دیگر افراد ہیں۔ وَیسے ہی وُہ بھی گھر کے افراد میں ایک فرد ہے۔ گھر کے دوسرے لوگوں میں اِس کی بھی گنتی ہے۔

یہاں پر اگر کوئی مصنّف کے متعلق یہ کہنے لگے کہ وُہ شیو چندر یا اُن کی پتنی پر الزام لگاتا ہے۔ اُلٹ پھیر کر بار بار اُن کی بُرائی کرتا ہے تو وُہ مُصنف کے تئیں ناانصافی ہو گی۔ دُنیا کا جو اُصول ہے۔ جو ریت ازل سے لے کر اَب تک چلی آ رہی ہے۔ اُس کو مُصنف یہاں بیان کر رہا ہے۔ مادھوی کے نصیب پھُوٹ گئے ہیں۔ "اپنا" کہہ کر جس پر حق جما سکے ایسی کوئی جگہ اُس کے لئے نہیں۔ مگر اِس سے دوسروں کو کیا؟ وُہ اپنی چیز پر دعویٰ کرنا کیوں چھوڑ دیں؟ وُہ اپنا چھوٹے سے چھوٹا معمولی سے معمولی بھی حق کیوں چھوڑیں۔ شوہر کی چیز پر بیوی کا حق ہوتا ہی ہے۔ یہ کون نہیں جانتا؟ کیا شیو چندر کی بیوی ہی یہ بات نہیں جانتی۔ شیو چندر تو مادھوی کا بھائی ہے۔ مگر اُس کی بیوی مادھوی کی کون ہے؟ وُہ کسی غیر کے لئے اپنا حق کیوں چھوڑ دے۔ مادھوی یہ سب خُوب سمجھتی ہے۔ بھاوج جب بالکل چھوٹی تھی اور برج بابو زندہ تھے تب مادھوی کی نظر میں چھوٹی بہن پرمیلا اور بھاوج دونوں ایک تھیں لیکن اب بات بات میں بھاوج کی رائے نہیں ملتی۔ مادھوی دِن کہتی ہے تو وُہ رات کہتی ہے۔ مادھوی بچپن سے ہی ضدّی طبیعت کی اور غضب کی حسّاس تھی۔ ذرا سی بات بھی اُس کے دِل میں لگ جاتی ہے۔ اِسی لئے اَب وُہ اپنے آپ کو سب سے حقیر سمجھتی ہے۔ کسی کی بات برداشت کرنے کی طاقت اُس میں نہیں۔ اِسی لئے وُہ کچھ بولتی ہی نہیں۔

جہاں اُس کا کچھ زور نہیں ہے وہاں سر اُونچا کر کے کھڑا ہونے میں شرم کے مارے جیسے اُس کا سر جھک جاتا ہے۔ دِل کو کچھ تکلیف پہنچنے پر وہ چُپ چاپ اُسے برداشت کر لیتی ہے۔ شیو چندر تک سے وہ کچھ کہتی سُنتی نہیں۔ پیار کا ثبوت دینے کا اُسے ذرا بھی ڈھنگ نہیں اِسی وجہ سے اسے کسی طرح سے بھی اپنا حق جتانا بالکل پسند نہیں۔ اِیسے حق کا خیال بھی اُس کے دِل میں آنے پر اُسکا جسم اور دِل سے لعنت کی لہر اُٹھنے لگتی ہے۔ عام عورتوں کی طرح لڑنے جھگڑنے سے اُسے کتنی شدید نفرت ہے۔ وُہ صرف وُہی جانتی ہے۔

ایک دِن مادھوی نے بھائی کو پاس بُلا کر کہا ——— "دادا میں سُسرال جاؤں گی۔" شیو چندر نے حیرانی سے پُوچھا ——— "ایسا کیوں دیدی۔ وہاں تو تمہارا اپنا کوئی بھی نہیں۔"

مادھوی نے مرحوم شوہر کی تصویر پر اِشارہ کرتے ہوئے کہا ——— "چھوٹا بھانجا کاشی جی میں نند جی کے پاس رہتا ہے اُسے ساتھ لے کر میں گول گاؤں میں اچھی طرح رہ سکوں گی۔"

پبنہ ضلع میں گولاگاؤں میں مادھوی کی سُسرال تھی۔ شیو چندر نے سوکھی ہنسی ہنس کر کہا ——— "یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہاں تمہیں بڑی تکلیف ہوگی ———"

مادھوی ——— "تکلیف کیوں ہونے لگی مجھے۔ وُہاں گھر تو ابھی ویسے کا ویسا ہی بنا کھڑا ہُوا ہے۔ دس پانچ بیگھے زمین بھی اپنی ہے۔ ایک بیوہ کا گذر بسر کیا اِتنے میں نہ ہو سکے گا؟"

شیو چندر ——— "گذر ہونے کی بات میں نہیں کہتا۔ روپے پیسے کی تو کچھ فکر ہی نہیں۔ میں یہ کہتا ہُوں کہ وہاں ویرانے میں اکیلے رہنے میں بڑی تکلیف ہوگی۔"

مادھوی ——— "کچھ بھی تکلیف نہ ہوگی ———"

شیو چندر ـــــ (تھوڑی دیر سوچ کر) "مگر تم یہاں سے جانا کیوں چاہتی ہو؟ مجھے سب واضح طور پر بتاؤ۔ میں سب جھگڑے ابھی نپٹائے دیتا ہوں۔"

اس سے پہلے جان پڑتا ہے کہ شیو چندر نے اپنی بیوی سے بہن کے خلاف کچھ ضرور سنا ہوگا۔ اُسی کا خیال آنے پر اُس نے یہ بات بھی کہی ہوگی۔ شرم سے مادھوی کا مُنہ سُرخ ہو گیا۔ کہنے لگی ـــــ "دادا کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں لڑ جھگڑ کر تمہارے گھر سے کہیں چلی جاؤں گی۔"

شیو چندر خود بھی شرمندہ ہُوا۔ کہنے لگا ـــــ "نہیں نہیں دیدی۔ میرے کہنے کا مطلب فقط اتنا ہی ہے کہ یہ گھر ہمیشہ سے تمہارا ہی ہے۔ پھر تم کیوں یہاں سے جانا چاہتی ہو؟"

ایک ساتھ دونوں ہی کو اپنے مرحوم مہربان پتا کا خیال آ گیا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آنچل سے آنسو پونچھ کر مادھوی نے کہا ـــــ "میں کیا ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔ پھر آؤں گی تمہارے لڑکے کا جنیو ہوگا تب مجھے وہاں سے لے آنا۔ اس وقت مجھے جانے دو بھیّا ـــــ!"

شیو چندر ـــــ "یہ موقع تو کہیں آٹھ دس سال میں آئے گا ـــــ"

مادھوی ـــــ "اگر زندہ رہی تو ضرور آؤں گی ـــــ"

مادھوی کسی طرح بھی پتا کے گھر میں رہنے کو تیار نہیں ہُوئی۔ اور اپنے جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اُس نے نئی آئی ہُوئی بہُو کو ساری گرہستی سونپ دی۔ سب کچھ سمجھا بجھا دیا۔ نوکر چاکروں کو بُلا کر اُنہیں آشیرواد دیا۔ جس دن جانے کا مُبارک مہُورت تھا اُس دن آنکھوں میں آنسو بھرے ہُوئے شیو چندر اپنی بہن کے آگے کھڑا ہو کر کہنے لگا ـــــ "مادھوی تیرے دادا نے تجھے کبھی کچھ کہا سُنا نہیں۔"

مادھوی نے مُسکرا کر کہا ـــــ "یہ کیسی باتیں کر رہے ہو دادا؟"

شیو چندر ـــــــ "میں یہ نہیں کہتا ہُوں۔ اگر کسی بُری گھڑی میں کسی دن میرے مُنہ سے بے خیالی میں کچھ ـــــــــــ ـــــ؟"

مادھوی! ـــــــ "نہیں دادا۔ تُم نے تو مجھے کبھی کچھ نہیں کہا۔"

شیو چندر ـــــــ "سچ؟ ـــــــــــــــ؟"

مادھوی ـــــــ "ہاں سچ ـــــــــــــــ"

شیو چندر ـــــــ "اچھا تو جاؤ۔ تمہیں اپنے گھر جانے کے لئے میں اب منع نہیں کر سکتا ہُوں۔ جہاں تمہیں اچھا لگے وہیں رہو۔ مگر ہاں ہمیشہ اپنی خیر و عافیت سے مُطلع کرتی رہنا۔ کبھی بھُولنا نہیں ـــــــــ"

مادھوی سب سے پہلے کاشی گئی۔ وہاں جا کر اپنے بھانجے کو ساتھ لیا۔ وہاں سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر گولا گاؤں میں آ گئی۔ آج سات سال کے بعد اُس نے دوبارا اپنی سُسرال کی دہلیز پر قدم رکھا۔

اَب تو گولا گاؤں کے چیٹر جی مہاراج پر جیسے بڑی بھاری مُصیبت کا پہاڑ ٹُوٹ پڑا۔ اُن سے اور یوگندر (مادھوی کا پتی) کے پتا سے بڑی گہری دوستی تھی۔ اِسی لئے مرتے وقت یوگندر اپنی کئی بیگھے زمین اُنہیں کو سونپ گئے تھے۔ یوگندر کی زندگی میں بھی وُہی اِس زمین کا بندوبست اور دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ یوگندر اُس طرف سے بالکل لاپرواہ رہتا تھا۔ اُس کے سُسر (مادھوی کے پتا) کے پاس کافی دولت تھی اِس لئے یوگندر کو اپنے پتا کی دی ہُوئی اِس معمُولی جائیداد کی کچھ زیادہ پرواہ نہ تھی۔ اِس کے بعد یوگندر کے مر جانے پر چیٹر جی مہاراج نے مکمل طور پر ملکیت پا کر بے فکر ہو کر بغیر کسی رُکاوٹ کے اُس ساری زمین کی آمدنی اپنے کام میں لانے لگے۔ لیکن اَب اِتنے دِنوں کے بعد یوگندر کی بیوہ مادھوی نے آ کر اُصول اور قاعدے کے ساتھ بندھی ہُوئی اُن کی سُکھ کی گزرتی مُفت مِل گئی۔ زِندگی میں گڑبڑ مچانے کی خبر دی۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بیالاک چیٹر جی

مہاراج کو یہ مادھوی کا آنا بہت بُرا اور ناجائز جان پڑا۔ اُنہیں صاف صاف دکھائی دینے لگا کہ مادھوی نے جلنی کے مارے جان بوجھ کر یہ شوشہ کھڑا کیا ہے۔ اُنہیں نے سنبھل کر مادھوی کے پاس آکر کہا۔

چیرڑجی! ——— "سُنتی ہو بہو۔ تمہاری وہ جو دو بیگھے زمین پڑی ہے اُس پر دس سالہ لگان کی رقم چڑھ چکی ہے۔ بمعہ سُود کے کُل سَو روپے ہو گئے ہیں۔ اگر یہ روپیہ نہ دیئے جائیں گے تو یہ زمین نیلام ہو جائے گی۔ سمجھی! ———"

مادھوی نے اپنے بھانجے سنتوش کمار سے کہلوایا۔ ——— "روپوں کے لیے کچھ فکر کی ضرورت نہیں۔"

اِس کے بعد لڑکے کے ہاتھ سَو روپے اُسی وقت بھجوا دیئے۔ قارئین کو یہ بتلا دینے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ روپے چیرڑجی نے اپنے ہی کام میں خرچ کر دیئے۔

لیکن مادھوی اِس طرح آسانی سے چھوڑنے والی عورت نہ تھی۔ اُس نے سنتوش کو بھیجکر پُوچھا! ——— "صرف اِن دو بیگھے زمین سے ہی تو میرے مرحوم سُسر جی کو گذارہ نہیں ہوتا تھا۔ باقی جو زمین ہے وُہ کہاں اور کِس کے ماتحت ہے؟"

یہ سُنتے ہی چیرڑجی آگ بگولا ہو اُٹھے۔ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کہنے لگے۔ "وُہ تو ساری زمین بِک گئی۔ کچھ تھوڑی سی سانجھے میں جوتی اور بوئی جاتی ہے آٹھ دس سال سے زمیندار کو لگان نہ دیا جائے گا تو زمین کیسے بچی رہے گی۔"

مادھوی! ——— "کیا زمین سے کچھ بھی آمدنی نہیں ہوتی تھی جو لگان کے روپے بھی نہیں دیئے جا سکے۔ اور اگر زمین سچ مچ بک ہی گئی تو اُسے کِس نے بیچا اور کِس نے خریدا معلوم ہو تو اُس کو پھر واپس لینے کی کوشش کی جائے۔ زمین کی خرید و فروخت کے تمام کاغذات کہاں ہیں ———؟"

چیرڑجی مہاشہ نے اُن سوالات کے جواب میں کچھ کہا ضرور تھا۔ لیکن مادھوی کی سمجھ

یں کچھ بھی نہ آیا۔ چیٹرجی بڑبڑاتے ہوئے گول مول زبان میں نہ جانے کیا بک گئے۔ اِس کے بعد پھر سر پر چھاتا تان کر رام نامی چادر کمر میں لپیٹے ہوئے ایک کوری دھوتی انگوچھے میں باندھ کر لالتا گاؤں کی طرف زمیندار کے دفتر جانے کے لئے اُسی دِن چل پڑے۔ اسی لالتا گاؤں میں ہمارے ٹمر نیدر کا گھر اور اُن کے مینجر متھرا بابُو کا دفتر بھی ہے۔ چیٹرجی آٹھ دس کوس راہ پیدل چل کر ایک دَم متھرا بابُو کے حضور میں جا حاضر ہوئے اور رو کر کہنے لگے۔ "دوہائی ہے مینجر صاحب۔ معلوم پڑتا ہے اَب مجھ غریب براہمن کو دَر دَر بھیک مانگ کر پیٹ اور پریوار پالنا ہوگا۔"

"اِس طرح کے بہت لوگ آیا کرتے ہیں"۔ متھرا بابُو نے مُنہ گھما کر کہا ——

"ہوا کیا ہے؟ کچھ کہو بھی تو ——؟"

چیٹرجی —— "بھیا براہمن کی رکھشا کرو ——"

مینجر بابُو —— "ارے کچھ بولو گے بھی کیا ہوا ——؟"

تب چیٹرجی نے وُہی مادھوی کے آئے ہوئے سَو روپے کمر سے نِکال کر متھرا بابُو کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے —— "آپ دیالُو ٹھہرے آپ ہمارے محافظ ہیں۔ اگر آپ ہماری حفاظت نہ کریں گے تو اَور کون کرے گا۔ میرا تو ستیاناس ہو رہا ہے ——"

مینجر —— "مجھے سب مُختصراً مختصر طور پر سمجھاؤ ——"

چیٹرجی —— "بات یہ ہے کہ گوالا گاؤں کے رہنے والے ۔۔ اِدھر تو سانیال کی بہو مادھوی اِتنے دِنوں کے بعد لوٹ آئی ہے۔ اَور اَب ساری زمین پر قبضہ جمانا چاہتی ہے"

متھرا بابُو نے ہنس کر کہا —— "وُہ تمہاری زمین دبا بیٹھی ہے یا اُس پر قبضہ جمانا چاہتی ہے یا تم اُس کی کُل کائنات پر ہاتھ صاف کر دینا چاہتے ہو؟ اصلیت کیا ہے؟"

پھر براہمن نے اپنے دونوں ہاتھوں میں جنیؤ لپیٹ کر قسم کھاتے ہوئے مینجر کا ہاتھ پکڑ کر کہا —— "میں دس سال سے اُس زمین کا لگان دیتا آ رہا ہوں۔"

منیجر ـــــــ "جب زمین سے فائدہ اُٹھاتے ہو تو کیا لگان نہیں دو گے؟"

چیڑجی ـــــــ "دوہائی ہے آپ کی حضور ـــــــ"

منیجر صاحب سب کچھ سمجھ گئے۔ بولے ـــــــ "بیوہ کو چکّر دے کر زمین ہضم کرنا چاہتے ہو نا ـــــــ؟"

چیڑجی چپ چاپ منیجر کا منہ تکتے رہے۔

منیجر ـــــــ "کُل کتنے بیگھے زمین ہے؟"

چیڑجی ـــــــ "پچیس بیگھے۔"

متھرا بابو نے زبانی حساب لگا کر کہا: "کم از کم تین ہزار روپے تک کی جائیداد ہے۔ اچھا زمیندار کو کتنی رقم نذرانے میں دو گے ـــــــ؟"

چیڑجی ـــــــ "آپ کا جو حکم ہو گا وہی دوں گا سرکار۔ تین سو روپیہ تک دے دوں گا۔"

"تین سو دے کر تین ہزار ہضم کرنا چاہتے ہو چیڑجی۔ جاؤ یہ کام مجھ سے نہ ہو سکیگا۔"

براہمن نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ـــــــ "آپ کتنے روپوں کا حکم دیتے ہیں ـــــــ؟"

منیجر ـــــــ "ایک ہزار روپے تک دے سکو گے ـــــــ؟"

اس کے بعد دونوں بہت دیر تک تنہائی میں بات چیت اور صلاح مشورہ کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یوگندر کی بیوہ مادھوی پر زمیندار کی طرف سے باقی دس سال کا لگان اور اس کا سود لگا کر کل ڈیڑھ ہزار روپے کی نالش ہو گئی۔ سمن جاری ہوا۔ لیکن مادھوی تک نہ پہنچا۔ اس کے بعد یکطرفہ ڈگری بھی ہو گئی اور ڈیڑھ مہینے کے بعد مادھوی نے سُنا کہ باقی لگان کی وصولی کے لئے زمیندار کی طرف سے اس کی زمین اور گھر تک نیلام کرنے کا اشتہار جاری کیا گیا ہے۔ اس کی ساری جائیداد قُرق ہو گئی۔

یہ سُن کر مادھوی نے ایک پڑوسن کو بُلا کر کہا ـــــ "بہن کیا تمہارے دیش میں بالکل اندھیر نگری ہے ـــــــ؟"

پڑوسن ـــــ "ایسا تو نہیں۔ کیوں کیا ہُوا ــــ؟"

مادھوی ــــ "مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ ایک شیطان اور جعل ساز دھوکہ دے کر اور جعل کر کے میرا سب کچھ ہڑپ کر لینا چاہتا ہے اور تم لوگ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔ تمہیں ذرا رحم نہیں آتا۔ اوہ! یہ کیسا اندھیر ہے بھگوان؟"

پڑوسن! ــــ "مگر میں کر ہی کیا سکتی ہُوں؟ ہم لوگوں کے بس میں کیا ہے؟ زمیندار اگر تمہاری زمین جائیداد نیلام کر دے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ہم غریب اور لاچار لوگ کر ہی کیا سکتے ہیں؟"

مادھوی! ــــ "خیر میں نے یہ بھی مان لیا۔ یہ پُوچھتی ہُوں۔ میرا گھر نیلام ہو گیا اور مجھے اُس کی خبر تک نہ ملی یہ کیا بات ہے؟ تمہارا زمیندار بھی کیسا ہے؟"

تب پڑوسن نے ساری باتیں تفصیل سے کہنی شروع کیں ــ ایسا ظالم زمیندار اور ایسا اندھیر، اور ایسا ظلم اِس دیش میں کبھی کسی نے دیکھا سُنا نہیں۔ اُس پڑوسن نے اور بھی نہ جانے کیا کیا بُرائی کی۔ آج تک لوگوں کی زبان سے زمیندار کے متعلق جو کچھ اُس نے سُنا تھا اور جو کچھ وہ خود جانتی تھی وہ سب ایک ایک کر کے اُس نے کہہ سُنایا۔ مادھوی نے ڈرتے ڈرتے پُوچھا۔ "اچھا میں خود زمیندار سے کہوں سُنوں تو کیا کچھ اُمید ہے؟ اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اپنے لئے نہیں فقط بھانجے کے لئے۔ مادھوی سب کچھ کرنے کو تیار بیٹھی تھی۔ پڑوسن اِس بارے میں اُس وقت کچھ صلاح نہ دے سکی۔ لیکن جاتے وقت یہ وعدہ کرتی گئی کہ کل وہ اپنی بہن کے لڑکے سے اچھی طرح پُوچھ تاچھ کر کے آئے گی اور بتلائے گی کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ اُس کی بہن کا لڑکا دو تین دفعہ لاتا گا ڈول تک ہو آیا تھا۔ زمیندار کے یہاں کی بہت سی باتیں وہ جانتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس دن باغ میں ایلوکیشی کے آنے رہنے اور

بھگائے جانے کی خبر تک بھی وُہ سُن آیا تھا۔ اُس کی موسی نے جب اُس سے یہ کہ رام تن کی بیوہ زمیندار بابو سے مُلاقات کرنا چاہتی ہے۔ اِس میں تیری کیا رائے ہے۔ تو اُس نے مُنہ بنا کر سنجیدگی سے پُوچھا ـــــــ "اُس بیوہ کی عُمر کیا ہوگی؟"

"بیس اکیس سال کی ہوگی۔"

اُس نے پھر سر ہلا کر پُوچھا ـــــــ "دیکھنے سُننے میں کیسی ہے؟"

"بالکل پری جیسی دکھائی دیتی ہے۔"

اُس نے عجیب ڈھنگ سے مُنہ بچکا کر کہا ـــــــ "ہاں تو مُلاقات کرنے سے اُس کا کام ٹھیک ہو جانے کی بہت کچھ اُمید کی جا سکتی ہے۔ لیکن سچ پُوچھو تو میری رائے یہی ہے کہ وُہ آج ہی رات کو چُپ چاپ ناؤ پر بیٹھ کر اپنے باپ کے گھر چلی جائے۔ اِسی میں اُس کی خیریت ہے۔"

پڑوسن ـــــ "ایسا کیوں ـــــــــ؟"

لڑکا ـــــ "تُم کہتی ہو نا کہ وُہ دیکھنے میں پری جیسی حسین ہے۔ ــــــ"

پڑوسن ـــــ "تو پھر اِس سے کیا ہُوا ـــــــ؟"

لڑکا ـــــ "اِسی سے تو خطرہ ہے کہ۔ پری جیسی حسین دوشیزہ زمیندار نریندر کی نظروں میں پڑ کر پھر اپنے دھرم کی حفاظت کسی طرح بھی۔ کسی حالت میں بھی نہیں کر سکتی سمجھیں تم ـــــــ"

پڑوسن ـــــ "کیا کہہ رہا ہے تُو؟ یہ حال ہے؟"

لڑکا ـــــ (ہنس کر) "ہاں مُوسی یہی حال ہے۔ وَہاں کے سب لوگ جانتے ہیں۔"

پڑوسن ـــــ "تب تو اُس کا زمیندار سے مِلنا ٹھیک نہیں۔"

لڑکا ـــــ "کسی طرح بھی نہیں۔"

پڑوسن ـــــ "لیکن یُونہی بیٹھے رہنے سے بیچاری بیوہ کا سب کچھ چلا جائے گا۔"

رڈکا ــــــ "وُہ بے ایمان اُور کمینہ چیڑجی جب اِس مُعاملہ میں موجُود ہے تب زمین اُور جائیداد بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔ بے چاری. بیوہ کیا گرہستھ کے ساتھ دھرم کو بھی گنوا دے گی۔؟"

دُوسرے دِن پڑوسن نے آکر مادھوی سے سارا واقعہ شروع سے لے کر آخیر تک سُنا ڈالا۔ سُن کر مادھوی سناٹے میں آگئی۔ زمیندار سُریندر کی کالی کرتوتوں کے متعلق وہ اب تک بہت کچھ سُن چکی تھی۔

مادھوی سوچنے لگی ــ سُریندر رائے۔ یہ سُریندر رائے کون ہے۔ یہ نام تو بہت ہی شناسا جان پڑتا ہے۔ لیکن عادات و اخلاق تو بالکل ہی نہیں ملتے جُلتے۔ اِس نام کو تو وُہ نہ جانے کتنے دِنوں سے دِل ہی دِل میں یاد کرتی آرہی ہے۔ اُس کو آج پُورے پانچ سال ہو گئے۔ کچھ کچھ بھُول چلی تھی۔ لیکن آج بہت دِنوں بعد پھر یاد آگئی۔

اُس رات مادھوی ٹھیک طور پر سو بھی نہ سکی۔ خواب بھی بڑے بڑے ڈراونے دِکھائی دیئے۔ بڑے دُکھ اُور تکلیف میں کٹی۔ بار بار پُرانی یادیں انگڑائیاں لینے لگی تھیں بار بار آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں۔ معصُوم سنتوش کمار نے اُسے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"مامی مَیں ماں کے پاس جاؤں گا"۔ مادھوی خُود بھی کئی بار یہی سوچ چکی تھی۔ کیونکہ جب یہاں کا اَن جَل اُٹھ گیا تو کاشی میں رہنے کے سِوائے اور کوئی چارہ نہیں اور کوئی دُوسری راہ نہیں جس پر وُہ چل سکے۔ اُس نے سنتوش کمار کے لئے بھی زمیندار سے ملاقات کرنے کا جو خیال کیا تھا وُہ اَب محض خیال ہی رہے گا۔

پاس پڑوس کے لوگ منع کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں ایک اُور فکر دامن گیر ہو گئی تھی۔ ایک اُور آفت اُٹھ کھڑی ہوئی تھی وُہ تھی اُس کے اپنے حُسن اور جوانی کی شہرت مادھوی نے اپنے دِل میں کہا کہ میری قسمت ہی پھُوٹی ہے۔ خُوبصُورتی وغیرہ کا جھگڑا کیا

آج کل شوہر پر شانتی کا پورا پورا رعب ہے اور پورا پورا حق ہے۔ اُس کی ایک بھی بات سُریندر نہیں ٹالتا۔ دراصل سُریندر نے کبھی بات ٹال کر شانتی کے دل کو تکلیف کبھی پہنچائی ہی نہیں۔ صرف چند بدمعاش دوست مل کر شانتی کو بڑا دُکھ دے رہے تھے۔ آج کل میونی کے نادر شاہی حکم سے سُریندر کا باہر کی مردانہ بیٹھک تک جانا بھی محال ہو گیا ہے۔ شانتی نے ڈاکٹر کی صلاح اور ہدایتیں لے کر اُن پر مکمل طور سے کاربند ہونے کی ٹھیک ٹھیک تیاری کر لی ہے۔

اُس وقت شانتی پتی کے ساتھ بیٹھی ہوئی لال فیتوں کے کاغذوں کے بنڈلوں کو باندھ باندھ کر رکھ رہی تھی۔ سُریندر نے ایک کاغذ دیکھتے دیکھتے سر اُٹھا کر یکایک پکارا — "شانتی!"

شانتی ابھی ابھی اُٹھ کر کہیں گئی تھی۔ دم بھر بعد واپس آ کر پوچھا — "کیا مجھے پکار رہے تھے؟"

سُریندر — "ہاں میں ذرا دفتر میں جانا چاہتا ہوں ——— ؟"

شانتی — "نہیں۔ بتاؤ کیا چاہیئے۔ میں یہیں منگوائے دیتی ہوں ———"

سُریندر — "نہیں کچھ بھی نہیں چاہیئے۔"

شانتی — "میں ابھی یہیں بُلوائے دیتی ہوں۔ آخر تم خود کیوں جاتے ہو اس وقت ایسا کون سا کام آ پڑا ہے۔"

سُریندر — "یہی کہنا ہے کہ پہلی تاریخ سے اُن کو جواب دے دیا جائے گا۔ اب اُن کی اور ضرورت نہیں۔"

یہ سُن کر شانتی کو بڑی حیرت ہوئی۔ لیکن خوشی بھی کچھ کم نہ ہوئی۔ اُس نے مطمئن ہو کر پوچھا۔

"بیچارہ کا جرم کیا ہے؟"

آج مادھوی کا ایکادشی کا برت تھا۔ لیکن سنتوش کے لئے تو ضرور ہی کہیں ناؤ روک کر رسوئی بنانی ہوگی اور اُسے کھانا کھلانا ہوگا۔

ملّاح نے کہا ——— "دستو پارا کے گنج میں ناؤ لگانا ٹھیک رہے گا وہاں سب کچھ ملتا ہے۔"

خادمہ نے کہا ——— "یہی کرو بھیا دس گیارہ بجے تک لڑکے کو کھا لینا ضروری ہے۔"

سیاہ کالے بادل بدستور جھکے ہوئے تھے۔ لیکن بارش تھم گئی تھی ——————— کھڑکی کے قریب رجسٹر اور دیگر کاغذات لے کر میز کے مقابل سُریندر ناتھ بیٹھا وصول۔ لگانا۔ اور جمع خرچ، بندوبست، معاملے اور مقدمات کی سب فائلیں لے کر ایک ایک کر کے اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھنا سُننا ایک طرح سے ضروری بھی تھا ساتھ ہی یہ وقت گذرنے کا ایک بہترین ذریعہ بھی تھا۔ اِس کے لئے اُسے شانتی کے ساتھ کچھ جھگڑا بھی کرنا پڑتا تھا۔

وہ اُسے کبھی کرنے نہ دینا چاہتی تھی۔ بڑی مشکل سے بڑی بحث مباحثہ کرنے کے بعد سُریندر شانتی کو یہ سمجھا سکا تھا کہ لکھنے پڑھنے سے آدمی کے دل کا درد نہیں بڑھ جایا کرتا۔ اور اُس وقت اُسے سہارا دے کر وہاں سے باہر لے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لاچار ہو کر شانتی نے یہ بات مان لی اور وہ اِس کام میں بوقت ضرورت شوہر کی امداد بھی کر دیا کرتی تھی۔

اَب تک بدن میں بنا ہی ہُوا ہے۔ آج سات سال بیت گئے' اِن باتوں کا اُسے خیال ہی نہ تھا۔ اِدھر خیال مرکوز کرانے والا کوئی تھا بھی نہیں۔ شوہر کی موت پر جب وُہ اپنے باپ کے گھر چلی آئی تھی تب سب نے اُسے "بڑی دیدی"۔ بٹیا۔ مائی" وغیرہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ اِن تمام عزّت و عقیدت کے منطابوں نے اُس کے دِل کو اَور بھی وقت سے پہلے ہی بُوڑھا بنا دیا تھا۔ حُسن اَور جُوانی کچھ نہیں جہاں اُسے بڑی دیدی کا کام کرنا ہوتا تھا۔ ماں کی ممتا اور سیوا کرنی ہوتی تھی۔ وہاں کیا ہو) کبھی اِس رُوپ اور جوانی کا خیال بھی دِل میں آسکتا تھا؟ پہلے خیال نہ تھا۔ اَب وُہ متفکر ہو گئی۔ کچھ خوف سا محسُوس ہونے لگا۔ خاص کر اِس جوانی کے مُعاملہ سے۔ شرم کی ہنسی ہنس کر اُس نے دِل میں کہا ——— "یہاں کے آدمی اندھے ہیں یا جانور؟" لیکن مادھوی نے غلطی کی ——— "سبھی کا دِل اُس کی مانند اکیس بائیس سال کی عمر میں ہی بُوڑھا نہیں ہو جاتا۔"

گھر کے بالکل پاس ہی ندی کا گھاٹ تھا۔ مادھوی نے ملاح سے کہا۔" سومراپور جانا ہے"۔ مادھوی نے سوچا ذرا چھوٹی بہن پرمیلا کو بھی دیکھتی چلوں۔

گولا گاؤں سے دس میل کے فاصلہ پر سومرا پُور میں پرمیلا کی شادی ہوئی تھی آج ایک سال سے وُہ سُسرال ہی میں تھی۔ پرمیلا پھر شائد کلکتہ جائے۔ لیکن اُس وقت مادھوی وہاں کہاں ہو گی۔ اِسی لئے اُس نے پرمیلا سے ایک بار مِل لینا ضروری سمجھا۔

صُبح سُورج کی پہلی کِرنوں کے ساتھ ہی ملاحوں نے ناؤ کھول دی۔ لہروں کے ساتھ ساتھ ناؤ بہہ نکلی ہوا مخالف تھی اِسلئے ناؤ ہلکی چال سے بانسوں کے جنگل سے ہو کر کیٹیلے نوک دار پودوں سے بچ کر سینٹھوں کے جھرمٹ کو پیچھے چھوڑتی ہُوئی دھیرے دھیرے چلی جا رہی تھی۔ بچے سنتوش کی خُوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا وُہ ناؤ میں چھپر کے اندر بیٹھا ہُوا وہیں سے ہاتھ بڑھا کر آس پاس کے درختوں کے پتّوں کو بڑی اُمنگ سے توڑنے لگا۔ ملاحوں نے کہا کہ ہُوا کا زور اگر کم نہ ہوگا تو کل دوپہر تک ناؤ سومراپور پہنچ سکے گی ———"

سُریندر ــــ "اُنھوں نے جُرم کیا کیا ہے؟ یہ تو میں ابھی ٹھیک طرح سے نہ بتا سکوں گا۔ لیکن وُہ بڑی بدمُعاشی کر رہے ہیں۔" اِس کے بعد عدالت کا سرٹیفکیٹ اور دیگر کئی کاغذات دِکھا کر کہا۔

"یہ دیکھو گولا گاؤں میں رہنے والی ایک بیوہ عورت کا گھر بار، زمین جائداد سَب کچھ نیلام میں دُوسرے نام سے خرید لیا ہے۔ مجھ سے اِس کے متعلق ایک دفعہ بھی نہیں پُوچھا۔"

شانتی نے دُکھی ہو کر کہا! ــــ "آہ! بیوہ پر یہ ظُلم کیا گیا ہے۔ یہ کام تو ٹھیک نہیں ہُوا۔ اُچھا یہ تو بتاؤ اُس نے اُس بیوہ کی جائداد آخر نیلام کیوں کروائی؟"

سُریندر ــــ "اُس پر دس سال کا لگان باقی تھا۔ سُود اور اپیل ملا کر کُل پندرہ سو روپے کی نالش کی گئی تھی۔"

رُوپے باقی ہونے کی بات سُن کر شانتی کے دِل میں متھرا بابُو کے تئیں غصّے اور نفرت کے جذبات کم ہو گئے۔ اُس نے ایک ہلکی سی مُسکراہٹ کیا تھ کہا۔ "تو پھر اِس میں مینجر کا کیا جُرم ہے کیا غلطی ہے۔ اِتنا تو وُہ چھوڑ بھی کیسے سکتے تھے؟"

سُریندر ناتھ خاموش ہو کر سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگا۔ شانتی نے پھر اُسی سلسلہ میں پُوچھا ــ "کیا تُم یہ سب کے سب روپے چھوڑ دینا چاہتے ہو؟ کیوں چھوڑ دوگے؟

سُریندر ــــ "چھوڑ نہ دُوں گا تو اور کیا کروں گا۔ ایک بے چاری بیوہ کا گھر بار ہتھیا کر کیا اِسے نکال باہر کر دُوں؟ تُمھاری کیا رائے ہے؟"

دِل کی گہرائیوں سے نکلے ہُوئے یہ الفاظ شانتی کے دِل میں کھب گئے، شرم سے پانی پانی ہو کر دُکھی دِل سے کہا۔ "نہیں کبھی نہیں۔ میں اُس بیوہ بہُو کو گھر سے باہر کرنے کی رائے کبھی نہیں دے سکتی۔ علاوہ ازیں اگر تُم رُوپے کسی کو دے بھی ڈالو تو مَیں کیوں راہ میں روڑے اٹکانے لگی ــــ؟"

سُریندر نے اب ہنسکر کہا ـــــ "یہ بات نہیں نہیں ہے شانتی۔ میرے رُوپے کیا تمھارے رُوپے نہیں ہیں؟ میرا اور تیرا کیا الگ الگ ہے؟ اچھا جب میں نہیں رہُونگا تب تم ـــــ"

شانتی ـــــ (گھبراکر) "یہ کیا کہتے ہو؟ چُپ رہو، ایسی باتیں نہ کرو ـــــ"

سُریندر ـــــ "اور کچھ نہیں شانتی۔ مَیں یہی پُوچھتا ہُوں کہ تم کام کروگی نا؟ نہیں میں پسند کرتا ہُوں۔ بولو نا ـــــ؟"

شانتی رونے لگی۔ کیُونکہ اُسے معلُوم تھا کہ شوہر کی صحت ٹھیک نہیں۔ اُس نے کہا ـــــ "تم ایسی باتیں کیُوں کیا کرتے ہو ـــــ ـــــ؟"

سُریندر ـــــ "مجھے بھلی لگتی ہیں۔ اِسی لئے۔ اچھا شانتی۔ میری آرزو کیا ہے۔ یہ کیا تم نہیں جان سکتیں ـــــ ـــــ؟"

شانتی نے آنسو پُوچھتے ہُوئے اثبات میں حامی بھردی۔

تھوڑی دیر بعد سُریندر نے پھر کہا ـــــ "میری بڑی دیدی کا نام ـــــ!"

شانتی نے آنکھوں سے اپنا آنچل ہٹاکر سُریندر کی طرف دیکھا۔

سُریندر نے کاغذ دکھاکر کہا: ـ "یہ دیکھو بڑی دیدی کا نام ـــــ!"

شانتی ـــــ "کہاں ہے ـــــ؟"

سُریندر ـــــ "یہ دیکھو لکھا ہے ـــــ "مادھوی دیوی۔ اِس کا گھر بار نیلام کردیا گیا ہے ـــــ"

دم بھر میں شانتی نے سارا ماجرا سمجھ لیا۔ اُس نے کہا: "اِسی سے شاید تم جائیداد واپس کر رہے ہو۔"

سُریندر ـــــ (مسکراکر) "ہاں یہی بات ہے۔ اُن کا جو کچھ ہوگا وہ سب ضرور واپس کردُوں گا۔ سَب کچھ۔ کوڑی کوڑی ـــــ"

مادھوی کی چرچا ہونے سے شانتی دِل میں کچھ دُکھی ہوئی۔ شاید اُس کے من میں مادھوی کے تئیں کچھ جلن کا بیج اُگ آیا تھا۔

شانتی ——— "وہ تمہاری بڑی دیدی نہیں ہیں۔ صرف مادھوی نام ہے، اور نام کسی بھی ہو سکتا ہے۔ فقط۔ نام ہی سے تو یہ ———"

سُریندر ——— "تو کیا بڑی دیدی کے نام کی کچھ عزت بھی نہ کروں ———؟"

شانتی ——— "عزت کرو۔ لیکن وہ تو اِس عزت سے با خبر بھی نہ ہوں گی۔ وہ نہ جان پائیں گی"

سُریندر ——— "وہ تو سب ٹھیک ہے۔ لیکن میں کیوں نہ عزت کروں؟ میں کس طرح اِس نام کی بے عزتی کر سکتا ہوں ———؟"

شانتی ——— "نام کی کہتے ہو تو یہی نام کتنی عورتوں کا ہو سکتا ہے ———"

سُریندر ——— "اچھا تم کیا دُرگا جی کا نام لکھ کر اُس کے اُوپر پاؤں رکھ سکتی ہو"

شانتی ——— "چھی، چھی، چھی۔ یہ کیا کہتے ہو؟ دیوی دیوتاؤں کے بارے میں۔"

سُریندر ہنسنے لگا۔ بولا ——— "اچھا دیوی دیوتاؤں کا نام جانے دو۔ میں تم کو پانچ ہزار روپے دُوں گا اگر تم میرا ایک کام کر دو ———"

شانتی نے خوش ہو کر کہا ——— "کون سا کام ———؟"

دیوار پر سُریندر کی ایک تصویر لگی ہوئی تھی اُسے سُریندر نے بیوی کو دکھا کر کہا ——— "اِس تصویر کو اگر تم ———"

شانتی ——— "کیا کہا ———؟"

اِسے چار براہمنوں کے ذریعے ندی کے کنارے جلا ———"

بجلی کا تار چھو جانے سے آدمی کے جسم کا سارا خون جیسے دَم بھر میں جم جاتا ہے۔ جیسے سانپ کے کاٹنے سے مُنہ نیلا ہو جاتا ہے بالکل یہی حالت شانتی کی بھی ہو گئی۔ اِس کے بعد آہستہ آہستہ کچھ کچھ ہوش و حواس ٹھیک ہو جانے پر تیکھی نظروں سے شوہر

کی طرف دیکھ کر وہ چپ چاپ نیچے اُتر گئی۔ شانتی نے اُسی وقت پروہت کو بُلا کر قاعدے کیسا تھ من کی شانتی کیلئے پُوجا کا سامان ٹھیک کر کے طرح طرح کی منتیں مان کر عہد کیا کہ بڑی دیدی چاہے جو بھی ہوں ان کے بارے میں اَب میں کوئی بات مُنہ سے نہ نکالوں گی پھر کمرے میں جاکر کواڑ بند کر کے بہت دیر تک بیٹھی روتی رہی۔ زندگی میں آج تک ایسی کڑوی اور کڑوی بات اُس نے نہ سُنی تھی۔

سُریندر بھی اِدھر کچھ دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ دفتر میں مینجر سے مُٹھ بھیڑ ہوئی۔ سُریندر نے چھوٹتے ہی یہ سوال کیا ——— "گولا گاؤں موضع میں کس کی جائیداد نیلام ہُوئی ہے ———؟"

مینجر ——— "مرحوم رام رتن سانیال کی ہُوگی ———"

سُریندر ——— "کیوں؟ ———"

مینجر ——— "دس سال سے مال گذاری نہیں ملی تھی ———"

سُریندر ——— "کہاں ہے کھاتہ دیکھوں تو ———"

متھرا بابو پہلے تو اِس غیر متوقع حکم سے چکرا گئے۔ پھر اُسی وقت سنبھل کر جواب دیا۔ "کاغذ اور کھاتے وغیرہ تو سب پبنہ میں ہی ہیں۔ وہاں سے لائے نہیں گئے ———"

سُریندر ——— "اچھا تو اُبھی لانے کے لئے آدمی بھیج دیجئے۔ کیا اُس لاوارث بیوہ براہمنی کے سر چھپانے تک کے لئے ذرا سی زمین بھی نہیں چھوڑی؟ شاید نہیں۔ وہ کہاں رہے گی بے چاری؟"

مینجر نے اب کی بار جرأت کا ثبوت دیا۔ "رہنے کی جگہ کیوں نہیں ہے۔ وہ اَب تک جہاں تھی وہیں جاکر اَب بھی رہے گی ———"

سُریندر ——— "اب تک کہاں رہ رہی تھی وہ ———؟"

مینجر ——— "کلکتہ میں اپنے پتا کے گھر ———"

سُریندر ۔۔۔۔ "اُس کے پتا کا کیا نام ہے ۔۔۔۔۔۔؟"

منیجر ۔۔۔۔۔ "برج لال لہری ۔۔۔۔۔۔۔"

سُریندر ۔۔۔۔ "اور اُس بیوہ کا نام ۔۔۔۔۔۔۔؟"

منیجر ۔۔۔۔۔ "مادھوی دیوی ۔۔۔۔۔۔۔!!!"

سَر جُھکا کر سُریندر وہیں بیٹھ گیا۔ مالک کی یہ حالت دیکھ کر منیجر تو گھبرا گیا۔ اُس نے پُوچھا! ۔۔۔۔ "کیا ہُوا؟ بات کیا ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا ۔۔۔۔۔؟"

سُریندر نے اِن سوالات کا کچھ جواب نہ دے کر ایک نوکر کو آواز دی۔ اُس کے آنے پر حکم دیا۔ "جلدی جا کر سائیس سے کہو کہ ایک اچھے گھوڑے کی زین کس کر سواری کے لئے تیار کرے۔ یہاں سے گولا گاؤں کتنی دُور ہوگا؟ میں اِسی وقت وہاں جانا چاہتا ہوں۔"

منیجر ۔۔۔۔ "کوئی دس کوس کے فاصلے پر ہوگا مالک ۔۔۔۔۔۔"

سُریندر ۔۔۔۔ (گھڑی دیکھ کر) "کوئی ایک بجے تک تو وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

گھوڑا آ گیا۔ سُریندر نے اُس پر بیٹھ کر پُوچھا ۔۔ "کدھر جانا ہوگا؟"

منیجر ۔۔۔۔ "پہلے جنوب کی جانب اور پھر مغرب کی طرف سیدھی راہ ہے۔"

سُریندر نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا ہَوا سے باتیں کرنے لگا۔

اِدھر یہ خبر سُن کر شانتی بے حال ہو گئی۔ ٹھاکر دُوارے میں جا کر ٹھاکر جی کے آگے اُس نے اِتنا سَر پٹکا کہ خُون بہنے لگا۔ وُہ بار بار کہنے لگی "پربھو! تمہاری یہی مرضی تھی کیا۔ تُم کو یہ سَب منظُور تھا۔ کیا میرے دِل کے دیوتا پھر لوٹ کر آ سکینگے۔ کیا اُنہیں پھر پھر دیکھ پاؤنگی؟"

اُدھر دُو سپاہی بھی گھوڑے دوڑاتے ہُوئے گولا گاؤں کی طرف تیزی سے چل دیئے۔ کھڑکی سے اُن کو جاتے دیکھ کر اُس کے مَن کو کچھ شانتی ملی اور دِل کو ڈھارس بندھی۔ آنسُو پُونچھ کر بار بار کہنے لگی "دُرگا ماتا! میں دو بکرے چڑھاؤں گی۔ اپنی چھاتی کا خُون دُوں گی۔ جتنا چاہو۔ ماتا دُرگا جتنا چاہو۔ جب تک تمہاری پیاس نہ بجھے۔ تب تک

اُتنا ہی اپنے دِل کا خُون تمہیں اَرپن کروں گی۔ میری منو کامنا پُوری کرنا ـــــــــ،،

گولا گاؤں ابھی دو کوس دُور تھا۔ گھوڑے کے کھُروں تک مُنہ کا جھین بہہ بہہ کر پہنچ چکا تھا۔ گھوڑا دھول اُڑاتا، نالے نالیاں اور گڑھے پھلانگتا ہُوا بڑی تیزی سے سرپٹ دَوڑ رہا تھا۔ اُس نے جلدی پہنچنے کی کوشش میں جان لڑا دی تھی۔ سر پہ آفتاب غصے میں آگ برسا رہا تھا۔

گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے سُرِیندر کا جی مچلنے لگا۔ متلی ہونے لگی۔ ایسا جان پڑنے لگا جیسے پیٹ کے اندر کی ایک رَگ کھنچ کر باہر نکل پڑے گی۔ دَم بھر کے بعد دو تین دفعہ تھوڑا تھوڑا خون ہونٹوں سے بہہ کر ڈھیلے ہُوئے کُرتے پر گر گیا۔ سُرِیندر نے ہتھیلی سے مُنہ سے آیا ہُوا خون پُونچھ ڈالا۔ ایک بجے سے پہلے ہی سُرِیندر کا گھوڑا گولا گاؤں میں پہنچ گیا۔ سڑک کے کنارے دو کان پر بیٹھے ہُوئے ایک دُوکاندار سے پُوچھا۔ "گولا گاؤں یہی نا؟"

دُوکاندار ـــــــ "جی ہاں ـــــــ"

سُرِیندر ـــــــ "رام رتن سانیال کا گھر کدھر ہوگا ـــــــ؟"

دُوکاندار ـــــــ "اُدھر۔ اُس طرف جائیے ـــــــ۔"

اُنگلی اُٹھا کر اُس آدمی نے جس طرف اِشارہ کیا تھا اُسی طرف گھوڑے کی لگام موڑ دی۔ کچھ منٹوں ہی میں گھوڑا سانیال بابو کے گھر پہ باہر ہی بیٹھک کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ دروازے پہ ایک سپاہی بیٹھا تھا۔ مالک کو اچانک اِس طرح آتے دیکھ کر اُس نے اُٹھ کر سلام کیا۔

سُرِیندر ـــــ "گھر میں کون ہے ـــــــ؟"

سپاہی ـــــ "جی کوئی بھی نہیں ـــــــ"

سُرِیندر ـــــ "جو عورت یہاں رہتی تھی وہ کہاں چلی گئی ـــــــ؟"

سپاہی ـــــ "وہ تو صبح سویرے ہی کرایہ کی ناؤ پہ بیٹھ کر جانے کہاں چلی گئیں۔"

سُرتیندر ـــــ "کِس راستے سے ــــــــــــ؟"

سپاہی ـــــ "اِدھر کی جانب ناؤ گئی ہے سرکار ندی کے کنارے کنارے۔"

سُرتیندر ـــــ "گھوڑا دوڑنے کی جگہ بھی ہوگی ــــــــــــ؟"

سپاہی ـــــ "ٹھیک سے معلوم نہیں۔ شائد ــــــــــــ۔"

سُرتیندر نے گھوڑے کی لگام کو موڑا۔ اور گھوڑا پھر مالک کا اِشارہ پاتے ہی سرپٹ دوڑنے لگا۔ دو کوس کے قریب جانے پر آگے راہ دِکھائی نہ پڑی۔ گھوڑے کا چلنا مشکل ہوگیا تب گھوڑے کو وہیں چھوڑ کر سُرتیندر پیدل ہی آگے بڑھنے لگا۔ ایک بار اُس نے دیکھا۔ کُرتے پر کئی ایک خُون کے قطرے جم سے گئے ہیں۔ اور ہونٹوں سے خُون بہہ رہا ہے۔ ندی کے کنارے پہنچ کر اُس نے چلّوسے کئی بار پانی پیا اور مُنہ دھویا۔ اِس کے بعد پھر پوری طاقت سے دوڑنے لگا۔ اُس وقت اُس کے پاؤں میں جُوتے بھی نہ تھے۔ سارے شریر میں کیچڑ اور اُس میں جگہ جگہ خُون کے دھبّے دکھائی دے رہے تھے۔ سینے پر تو جیسے کِسی نے پچکاری ماری ہو۔

دِل ڈوب چلا۔ پاؤں اَب اُٹھتے نہ تھے۔ جیسے اُس نے اَب کی بار ہمیشہ کے لئے سو جانے کا اِرادہ کرلیا ہو اور اِس میں آخری موت کی سیج پر زندگی کے آرام کی تمنّائیں بڑی اُمنگ سے تیز تیز دوڑ رہا ہو۔ اُس کے بدن میں جتنی طاقت تھی وُہ بغیر کِسی اُور خوف کے خرچ کرنے کے بعد اُس نے جیسے آخری سیج پر پناہ لینی تھی۔ پھر کبھی نہ اُٹھنا تھا۔

وُہ ندی کے اُس پار.... موڑ کے قریب..... ایک ناؤ ہی تو ہے۔ بیدیئے پودوں کو ہٹاتی ہُوئی آگے بڑھنے کے لئے وُہ صاف کرتی چلی جارہی ہے..... وُہ..... وُہ..... ہاں...... ... ہاں..... ناؤ ہی ہے..... وُہی ناؤ ہے.... سُرتیندر نے زور سے پُکارا۔ "بڑی دیدی"... گلا سُوکھ رہا تھا.... آواز تو نِکلی نہیں.... لیکن کئی قطرے خُون کے نِکل پڑے۔ پھر زور سے پُکارا "بڑی دیدی".... پھر وُہی حال ہُوا۔ خُون کافی مِقدار میں نِکلا۔ کنارے پر اُگے ہُوئے پودے بار بار ناؤ کی راہ روک رہے تھے۔ اِسی لئے اِس بیچ میں سُرتیندر اُس کے قریب پہنچ گیا۔

اُس نے پھر پُکارا ..... "بڑی دیدی ———— !!!"

دِن بھر کے دُکھ اور جسمانی تکلیف کی وجہ سے مادھوی مُردہ سی ناؤ میں سو رہی سنتوش کے قریب ہی آنکھیں مُوندے پڑی تھی۔ یکایک "بڑی دیدی" کی پُکار سُن کر چونک اُٹھی - یہ پُرانے جانے پہچانے لہجے میں اُسے کون پُکار رہا ہے۔ ہاں وُہی آواز..... مادھوی اُٹھ کر بیٹھ گئی - باہر سَر نکال کر دیکھا... ماسٹر صاحب ہی تو معلوم پڑتے ہیں سارا جسم مٹی اور کیچڑ سے لت پت ہو رہا ہے۔

مادھوی نے اپنی خادمہ کو پُکار کر کہا "سوپنا کی ماں! سُنتی ہے ملّاح سے کہہ دے جلدی سے کشتی کو روک دے۔ یہیں پر کنارے پر لگا دے ————"

اُس وقت سُریندر میں رتی بھر بھی طاقت نہ تھی۔ وُہ وہیں کنارے پر آہستہ سے ہاتھ پیر پھیلا کر لیٹ گیا۔ سب مِل کر سُریندر کو ناؤ پر اُٹھا لائے۔ مُنہ اور آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مار مار کر ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ ایک ملّاح سُریندر کو پہچانتا تھا۔ اُس نے کہا۔

"یہ تو لالتا گاؤں کے زمیندار ہیں ————"

مادھوی نے جھٹ سے اپنے گلے کا سونے کا ہار نکال کر ملّاح کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور کہا "کیا آج رات کو لالتا گاؤں پہنچا سکتے ہو؟ میں سب کو ایسا ہی ایک ایک ہار انعام میں دُوں گی؟"

سونے کا ہار دیکھ کر تین طاقتور جوان ملّاح اُسی وقت رسّی لے کر پانی میں اُتر گئے۔ اُنھوں نے کہا "ماتا جی! رات چاندنی ہے اس لئے ہم صبح ہوتے ہوتے ضرور پہنچ جائینگے"

شام ہو جانے کے بعد سُریندر کو ہوش آیا۔ آنکھیں کھول کر وُہ مادھوی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اِس وقت مادھوی کے مُنہ پر پردہ نہ تھا۔ فقط ماتھے کا کچھ حصّہ

آنچل سے ڈھکا ہُوا تھا۔ وُہ گود میں سُریندر کا سَر رکھے بیٹھی تھی۔

کُچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد سُریندر نے کہا! "تُم میری بڑی دیدی ہو نا۔؟"

مادھوی نے آنچل سے سُریندر کے ہونٹوں پر لگے ہُوئے خُون کو اچھّی طرح صاف کرتے ہُوئے آنکھیں پُونچھ کر کہا۔

"میں مادھوی ہُوں۔ مادھوی۔!!!"

سُریندر نے آنکھیں مُوند کر دھیرے سے کہا۔ "آہ! وُہی تو ——!"

دُنیا بھر کا سکُون اور مسرتیں جیسے اُس کی گود میں چھُپی ہُوئی تھیں۔ اِتنے دِنوں بعد سُریندر نے اُس شانتی اور سُکھ کو آج پالیا تھا۔ اُس کے خُون سے بھرے ہُوئے ہونٹوں کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیلنے لگی۔

سُریندر نے کہا —— "بڑی دیدی مجھے بڑی تکلیف ہے۔"

کشتی تیزی کے ساتھ جا رہی ہے۔ اندر سُریندر کے چہرے پر چاند کی کرنیں ناچ رہی ہیں۔ خادمہ ایک ٹوٹا پنکھا لے کر آہستہ آہستہ ہَوا کر رہی ہے۔ سُریندر نے دھیرے سے پُوچھا۔ "کہاں جا رہی تھیں؟"

مادھوی نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا —— "پرمیلا کی سُسرال ——!"

سُریندر نے کہا! —— "جیجی اِس طرح کوئی رشتہ دار کے گھر جاتا ہے دیدی؟"

اپنے گھر میں اپنے سونے کے کمرہ میں، بڑی دیدی کی گود میں اپنا سَر رکھے سُریندر اِس وقت بستر مرگ پر پڑا ہے۔ دونوں پاؤں کو گود میں رکھے شانتی اپنے آنسوؤں سے اُنہیں

دھو رہی ہے۔ پینہ میں جتنے ڈاکٹر اور وید تھے سب مل کر کوشش اور محنت کرنے سے بھی خون بند نہیں کر پا رہے ہیں۔ پانچ سال پہلے کا کہنہ ناسور آج مسلسل خون اُگل رہا ہے۔

ہم مادھوی کے دل کی بات نہیں کہہ سکتے۔ ہم خود بھی اُسے اچھی طرح نہیں جانتے۔ اس وقت اُسے پانچ سال پہلے کی بات یاد آ رہی ہے۔ جب اُس نے سُریندر کو گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ اور پھر اُسے واپس نہ لا سکی تھی۔ لیکن پانچ سال بعد سُریندر اُس کو لوٹانے آیا ہے۔

شام کے بعد چراغ کی روشنی میں سُریندر ناتھ نے مادھوی کے منہ کو دھیان سے دیکھا۔ پاؤں کے پاس شناخت بھی بیٹھی ہے۔ کہیں وہ سُن نہ لے۔ اِسی لئے مادھوی کے مُنہ کو اپنے قریب لا کر اُس نے آہستہ سے کہا ——— "بڑی دیدی کیا تمہیں اُس دِن کی بات یاد ہے جب تم نے مجھے اپنے گھر سے نکال دیا تھا؟ میں نے اُس کا بدلہ لیا ہے۔ تم کو بھی نکال دیا۔ کیوں بدلہ پورا پورا لے لیا ہے نا۔؟"

مادھوی بے ہوش سی ہو گئی۔ اُس کا سر جھک کر سُریندر کے کندھے کے پاس آ گیا۔ جس وقت اُسے ہوش آیا اُس وقت گھر میں رونے دھونے کا بھیانک کہرام مچا ہوا تھا۔

چھوٹا بھائی

رام جتنا چھوٹا تھا۔ اُس سے کہیں زیادہ کھوٹا تھا۔ لوگوں کو پریشان اور شیطانی کی باتیں سوچنے میں وُہ اپنے گاؤں میں سب سے بیش بیش تھا۔ یہ اندازہ لگانا کہ اُس کی شیطنت کا شکار کب۔ کون اور کس طرح ہوگا بے چارے گاؤں والوں کے لئے جاننا قطعی ناممکن تھا۔

اُس کے بڑے بھائی کا نام شیام لال تھا۔ وُہ دونوں سوتیلے بھائی تھے۔ شیام لال گاؤں کے زمیندار کی کچہری میں نوکری کرتا تھا۔ اُس کے پاس کھیتی باڑی کے لئے کچھ زمین تھی ایک تالاب، ایک بافیچہ اور ایک کھلیان بھی تھا۔ علاوہ ازیں دس بارہ چھوٹی ذات کے لوگ اُس کی زمین پر رہائش بھی رکھتے تھے۔ غرضیکہ گاؤں میں اس کی حیثیت اچھی سمجھی جاتی تھی۔

آج سے تیرہ سال کی بات ہے کہ نارائنی شیام لال کی بہو بن کر گھر میں آئی تھی۔ اسی سال رام کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ مرتے وقت وُہ اتنی بڑی گرہستی کا بوجھ اور اس اڑھائی سال کے معصوم بچے کو تیرہ سال کی اپنی بہو نارائنی جو خود ہی ایک بچہ تھی کے کندھوں

ڈال گئی۔ نارائنی نے بھی بڑی ہوشیاری سے اتنا بڑا بوجھ سنبھالا اور بڑی ہوشیاری سے اُبھی تک سارے کام کاج کو چلاتی آرہی تھی۔ اِس کے لئے ضرور اُس بڑھیا کی رُوح اِسے آشیرواد دے رہی ہوگی۔ رام سے نارائنی کو بے حد پیار تھا۔ کیونکہ اُسی نے رام کو بچپن سے پالا پوسا تھا۔ پرورش کی تھی۔ اور وہ رام کو اپنے بیٹے گوبند سے بھی زیادہ چاہتی تھی۔ رام بھی اپنی بھابھی کی عزّت کرتا تھا اور اُس کے لئے دِل میں عقیدت رکھتا تھا۔ دُنیا میں اگر اُسے کسی کا خیال تھا تو فقط اپنی بھابھی کا۔

ایک تو برسات کا موسم اُس پر بنگال کا گاؤں۔ ایسے میں تو ملیریا اور دیگر بیماریاں جی بھر کر اپنا ہاتھ دِکھاتی ہیں۔ ہمیشہ کے مانند اِس دفعہ بھی برسات میں رام کے گاؤں میں ملیریا نے کافی زور پکڑا۔ ایسے وقت میں گاؤں کے ڈاکٹر نیلمنی سرکار کی خوب بن آئی۔ آس پاس کے کئی گاؤں کو مِلا کر وُہی ایک ڈگری یافتہ ڈاکٹر تھے۔ سب لوگ صبح سے لے کر شام تک اُنہیں گھیرے ہی رہتے۔ اِس دفعہ تو اُن کی فیس ایک روپے سے بڑھ کر دو روپے ہو گئی تھی۔ اِس پر بھی اکتفا نہ کرتے ہُوئے اُنھوں نے کونین کی بجائے میدہ اور اراروٹ کی ہی پُڑیا بنا کر بیچنا شروع کر دیں۔ بیچارے سادہ لوح دیہاتی اُن کی اِس کاروباری چال کو کیا سمجھتے۔ وُہ تو ڈاکٹر بابُو کو دیوتا سمجھتے تھے اور گِڑگڑا کر اُسے ہی دَوا سمجھ کر لے جاتے تھے۔ جو لوگ اَچھے ہو جاتے تھے وُہ تو ڈاکٹر بابُو کو فرشتہ کہتے اور جو بیچارے روگ سے جانبر نہ ہو کر موت کے آغوش میں چلے جاتے اُن کے عزیز و اقربا سمجھتے کہ بدقسمتی نے اُن پر حملہ کیا ہے۔ اِس میں ڈاکٹر بیچارہ کیا کر سکتا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر نیل منی کی چاندی ہی چاندی تھی۔ پانچوں اُنگلیاں گھی میں تھیں اور وہ ایسے موقعوں سے خوب فائدہ اُٹھا کر دونوں ہاتھوں سے پیسہ بٹورتے تھے۔

اِس دفعہ نارائنی کو بُخار نے خوب دَبایا۔ آج روز سات روز ہو گئے۔ بُخار اُترنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ شیام لال بیچارے بہت متفکر تھے۔ رام بھی اپنی بھابھی کے پاس جا بیٹھا

سے چڑھی ہوئی آنکھیں اور تمتمایا ہوا منہ دیکھ کر چپ چاپ چلا آتا۔ اُس کے مُنّدند دماغ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وُہ کیا کرے۔ جس سے اُس کی بھابھی کو بُخار سے نجات مِل جائے۔

گھر کی خادمہ نرت کالی ڈاکٹر کو بُلانے گئی۔ اُس نے واپس آکر خبر دی کہ آج ڈاکٹر بابو نہیں آئیں گے۔ کیونکہ اُنہیں دُوسرے گاؤں میں جانا ہے اور وہاں سے اُن کو چار روپے مِلنے ہیں۔

اُس کی بات سُنتے ہی شیام لال نے جھلّا کر کہا ——— "آئیں گے کیسے نہیں؟ کیا میں چار روپے نہیں دے سکتا؟ جا تو اُنہیں ابھی لے آ۔ جان پیاری ہے یا پیسہ؟"

بستر پر پڑی نارائینی نے بھی یہ سُنا اور تکلیف سے بھری آواز میں شیام لال کی طرف اِشارہ کرکے کہا ——— "سُنتے ہو جی۔ آپ اِتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو ذرا سا تو بُخار ہے اُتر جائیگا کل ہی ڈاکٹر بابو دیکھ جائیں گے۔ ایک دِن میں کون سا بڑا نُقصان ہو جائے گا ——— ———؟"

آنگن میں امرود کے درخت تلے تنکے اِکٹھا کئے بیٹھا رام چڑیا پکڑنے کے لئے پنجرہ بنا رہا تھا۔ اُس کے کان میں بھی یہ آوازیں جا پہنچیں۔ ایک تو ویسے ہی بھابھی کی بیماری نے اُسے پریشان کر رکھا تھا۔ دُوسرے ڈاکٹر بابو کا آنے سے اِنکار سُن کر اُس کا سارا غصہ بھڑک اُٹھا۔ وُہ اُٹھ کر دروازے تک آیا اور باہر جاتی ہوئی نرت کالی سے بولا ——— "تو ٹھہر جا پگلی میں خود ڈاکٹر بابو کو بلانے جا رہا ہوں۔"

دیور کی باتیں سُن کر نارائینی فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی اور شیام لال سے بولی۔ "رام کو روکئے اُسے باہر نہ جانے دیجئے" تب رام کو پُکارتے ہوئے بولی ——— "اے رام! تو واپس آ جا بیٹا۔ تجھے میرے سر کی قسم۔ کسی سے جھگڑا نہیں کرتے۔ آ تو چلے آؤ

اُسے ذرا بھی شک نہیں تھا کہ اَب ڈاکٹر بابُو کی خبر نہیں اِسی لئے وُہ پریشان ہو رہی تھی۔
رام نے نارائینی کی آواز پر کان نہ دھر کر اُسی جھونک میں دروازے سے باہر نکل گیا۔ پانچ سال کا بھتیجہ گوبند اُس وقت بھی ایک طرف پنجرہ پکڑے بیٹھا تھا۔ اِس اُمید پر کہ ابھی چاچا باقی کا پنجرہ مکمل کریں گے۔ وُہ اپنے چاچا کا بڑا مُرید اور تابعدار تھا۔

نارائینی بے چاری سَر ہاتھ پر رکھے روتی روتی شوہر سے کہنے لگی "آپ نے اُسے روکا تک نہیں۔ اَب دیکھئے اَب وُہ کیا شرارت کر کے آتا ہے۔ کیا گُل کھِلا کر آتا ہے ———؟"

ایک تو ڈاکٹر کے نہ آنے سے شیام جھلّائے بیٹھے تھے۔ دُوسرے اِس منظر نے اُنہیں اور بھی بھڑکا دیا۔ کہنے لگے ——"میں کیا کرُوں؟ جب تمہاری ہی بات اُس نے نہ سُنی تو میری کیا سُنے گا؟ تمہارے سامنے تو وُہ مجھے گنتی میں بھی نہیں لاتا ———"

"آپ نے میری خاطر اُس کا ہاتھ پکڑ کر روک کیوں نہیں لیا۔ اُس بے ہُودہ کی وجہ سے میں ایک لمحہ بھی سُکھ کی سانس نہیں لے پاتی۔ ہِنیا اِدھر آ! اب کھڑی نہ رہ جا فوراً بھولا رام کو پیچھے بھیج دے۔ کہ وُہ اُسے سمجھا بجھا کر واپس لے آئے ابھی رام زیادہ دُور نہیں گیا ہوگا۔ جا جا تُو جلدی جا ———"

نرت کالی خادمہ بھولا کی تلاش میں چلی گئی۔ اِدھر رام نیل منی ڈاکٹر کے دروازے میں آ پہنچا۔ دواخانہ کیا تھا۔ مکان کے باہر ایک چھپّر ڈال کر چھوٹی سی بیٹھک بنائی گئی تھی۔ اُسی میں ایک کونے میں ایک ٹُوٹی پھُوٹی الماری تھی۔ جس میں بہت سی پُڑیاں اور شیشے کی بوتلیں تھیں۔ الماری کے سامنے ایک بہت پُرانا اور خستہ سا میز پڑا تھا جس کے ایک کنارے پر چھوٹا سا ٹُوٹا ترازو پڑا ہُوا تھا۔ رسّی باندھ کر کام کے

لائق بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نیل منی سرکار ایک کرسی پر میز کے سامنے بیٹھے ترازو میں دوائیوں کا وزن کر رہے تھے۔ پانچ چھ مریض زمین پر بیٹھے ڈاکٹر بابو کو دوائیوں کا وزن کرتے ہوئے منہ بنا کر دیکھ رہے تھے۔

رام کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑا یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ڈاکٹر سے پوچھا "ڈاکٹر بابو میری بھابھی کا بخار کیوں نہیں اترتا؟"

ڈاکٹر نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا ——— "بخار نہیں اترتا میں کیا کروں۔ دوا تو دے رہا ہوں ———"

رام ——— "دوا کیا دیتے ہیں ٹکی دیتے ہیں۔ کونین کے بدلے۔ سڑے میدے کی پڑیا کیا کبھی بخار اتار سکتی ہے۔"

رام کی اس تیکھی بات کو سن کر ڈاکٹر بابو کا پارہ ایک دم ساتویں آسمان پر جا چڑھا۔ مارے غصے کے وہ کچھ بول نہ سکے۔ صرف لال لال آنکھوں سے اس کو گھورتے ہی رہ گئے۔ انہیں خواب میں بھی اس بات کی توقع نہ تھی کہ اتنی بڑی بات کوئی اس سادگی سے ان کے منہ پر کہنے کی جرأت کر سکے گا۔

تھوڑی دیر بعد وہ گرجتے ہوئے بولے ——— "تم لوگ جب یہ جانتے ہو کہ میں سڑے میدے کی پڑیاں دیتا ہوں تو مجھ سے دوا لینے ہی کیوں آتے ہو؟ اس کے علاوہ تمہارے بھائی شیام لال میرے پاؤں گر کر مجھے لینے کیوں آتے ہیں؟"

رام ——— "اس جگہ کوئی اور ڈاکٹر نہیں ہے اسی لئے آپ کو بلایا جاتا ہے اگر کوئی دوسرا ڈاکٹر ہوتا تو آپکو بلانا تو کہیں دور رہا آپکی کوئی شکل دیکھنے بھی نہ آتا۔"

سب لوگ پتھر کی مورتیوں کے مانند بیٹھے چپ چاپ سن رہے تھے۔ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ آج ڈاکٹر بابو کی خیر نہیں ہے۔ رام نے ایک دفعہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے ڈاکٹر بابو سے کہا ——— "تم لوگ چھوٹی ذات کے ہو۔ برا نہ

کی عزت دو تو تیر کو کیا سمجھو۔ اسی لئے جھٹ زبان سے نکال دیا کہ میرا بھائی تمہارے منہ لگاتے کیوں آتا ہے۔ میرے بھیا کو کسی کے پاؤں گرنے کی عادت نہیں ہے۔ یہاں آتے وقت بھابھی نے اپنے سر کی قسم دے دی تھی نہیں تو ابھی ہی چھوٹے منہ کو اتنی بڑی بات کہنے کا مزا بتا دیتا۔ لیکن ایک بات کہے جاتا ہوں ـــــ " ڈاکٹر بابو یاد رکھئے گا ابھی دوا دے کر ابھی بھابھی کو دیکھنے چلے آیئے۔ اگر آج بھابھی کا بخار نہیں اترا تو اس کا نتیجہ برا ہوگا۔ یہ سامنے جو آم کے درخت لگا رکھے ہیں ان کی ایک ڈال بھی رات کو نہ بچے گی۔ سب کلہاڑی سے ٹکڑے ٹکڑے کٹ پایئے گا۔ اس کے علاوہ کل آکر آپ کی تمام شیشیاں اور بوتلیں بھی چور چور کر جاؤں گا۔ اتنا کہہ کر رام دوا خانہ سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر نیل منی سرکار دم بخود رہ گئے۔ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ رام کی باتیں ان کے دل میں گویا چبھ سی رہ گئیں۔ وہ رام کے نام سے اچھی طرح واقف تھے۔

پیچھے بیٹھے ہوئے ایک مریض نے ہمت کر کے ڈاکٹر بابو سے کہا ـــــ " ڈاکٹر بابو سب ٹھیک کہہ گیا۔ بیکار ہو آپ کو دیر نہ کیجئے۔ کہیں اچھی دوا چھپا کر رکھی ہو تو فوراً لے کر چلے جائیے۔ آپ نہیں جانتے کہ وہ رام ہے۔ جو کہتا ہے اُسے کر کے ہی چھوڑتا ہے۔"

ڈاکٹر ـــــ " میں تھانے میں جا کر اس بات کی ابھی رپورٹ کروں گا۔ تم سب اس واقعہ کے گواہ ہو۔ تمہیں داروغہ کے سامنے شہادت دینی ہوگی۔"

اسی بوڑھے نے جس ڈاکٹر بابو کو صلاح دی تھی جواب دیا ـــ " گواہی کون دے گا بابو؟ یہ ـــ کان تو کونین کھاتے سن ہو چکے ہیں۔ رام کیا کہہ گیا ہے اُسے ٹھیک سے سن بھی نہ پائے۔ اور پھر داروغہ بھی کیا کرے گا۔ رام دیکھنے ہی میں چھوٹا ہے لیکن اس کے پاس بڑوں کی جو فوج ہے وہ چھوٹی نہیں۔ جب سب مل کر چھپر میں آگ لگا دیں گے تو تھانے دار کو پتہ نہیں آئے گا۔ اور نہ ہی اس کا پتہ لگ سکے گا کہ آگ کس نے لگائی ہے۔ ہم لوگ گواہی نہ دے سکیں گے۔ اور نہ ہی ہم لوگ بیکار میں اُس

کے خلاف جا کر نقصان ہی کروانا چاہتے ہیں۔ ہم لوگ اُس سے بہت ڈرتے ہیں۔ بھلائی تو اسی میں ہے کہ وہ جو کچھ کہہ گیا ہے اُسی پر عمل کیجئے۔ اچھا ڈاکٹر بابو ایک دفعہ میری نبض تو دیکھئے۔ بخار ہے یا نہیں۔ مارے بھوک کے طبیعت بہت پریشان ہے۔ دو ایک دن تو کھا سکتا ہوں کہ نہیں؟"

ڈاکٹر بابو تو یوں ہی اندر جل کر خاک ہو رہے تھے۔ اس بڈھے کی نبض دیکھنے کی بات سن کر اور بھی بھڑک اٹھے۔ کہنے لگے ——— "جب تم لوگ میری طرف سے گاؤں ہی دینا نہیں چاہتے تو کیا یہاں میری صورت دیکھنے کو بیٹھے ہو۔ میں کسی کا بھی ہاتھ نہیں دیکھوں گا۔ مر جاؤ گے تو بھی کسی کو دوا نہیں دوں گا۔ تم لوگ چلے جاؤ یہاں سے۔"

وہ بوڑھا اپنی لاٹھی اٹھا کر کھڑا ہوا اور چلتے چلتے بولا ——— "ڈاکٹر بابو غصہ مت ہوجیئے۔ اس میں کسی کا بھی قصور نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ رام بہت بڑا شیطان ہے اُس سے سبھی خوف کھاتے ہیں۔ مجھے جا کر ابھی اس سے اطلاع کرنا ہوگا نہیں تو کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ ہمیں لوگوں نے آپ کو تھانہ جانے کی صلاح دی ہے۔ قریب ایک مہینہ تک میں بینگن لگائے ہیں۔ اس سال بہت اچھی فصل ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج رات کو وہ اس کی فوج شبخون مار دے اور میں غریب بے چارہ بے موت ہی مارا جاؤں۔ ڈاکٹر بابو کی اندر دیکھ تھانہ پٹ جائے گا۔ آج تو ایک شیشی بڑھیا دوا کی دے کر اسے منا آئیے۔"

بوڑھا تو اتنا کہہ کر چلتا بنا اور جو باقی لوگ وہاں بیٹھے تھے ڈاکٹر کا رخ پھیر جاتے دیکھ کر ایک ایک کر کے دواخانہ سے نکلنا شروع ہو گئے۔ تب تو ڈاکٹر بھی ایک لمبی سانس لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور یہ کہتے ہوئے اندر چلے گئے کہ اس جہان میں بھلائی کا بدلہ برائی ہے۔ اس لئے کبھی بھی کسی کے ساتھ بھلائی نہ کرنی چاہیئے۔"

رام کی ماں بھی نارائنی کھڑکی کی طرف ٹکٹکی لگائے آدھی رات سے رام کا انتظار کر رہی تھی۔ رام نے مکان کے اندر آ کر آنگن سے ہی آواز لگائی ——— "گو بندا آؤ ہم لوگ

پنجرہ بنا رہیں۔ چاچا کی آواز سن کر نارائینی کے پاس لیٹا ہوا گوبند تو جھٹ سے اُٹھ کر آنگن کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن نارائینی نے رام کو پکارا —— "رام اِدھر آ —— !"

پنجرے میں ایک سلائی لگا کر کہتے ہوئے رام نے جواب دیا —— "ابھی نہیں آ سکتا کام کر رہا ہوں —— "

غصے میں نارائینی چلائی —— "میں کہتی ہوں ابھی اِدھر آ۔"

پنجرے کی سلائیوں کو گوبند کے ہاتھوں میں تھما کر رام آہستہ سے بھابھی کے کمرہ میں آ کر تخت پر بچھے ہوئے بچھونے کی پائینتی پر بیٹھ گیا۔

نارائینی نے پوچھا —— "ڈاکٹر بابو سے ملاقات ہوئی۔؟"

رام —— "ہاں —— "

نارائینی —— "اُن سے کیا کہا —— ؟"

رام —— "آنے کے لئے کہہ دیا ہے —— "

نارائینی کو اِس بات پر یقین نہ آیا۔ وُہ جانتی تھی کہ رام اتنا سیدھا نہیں ہے۔ اُس نے پھر پوچھا —— "صرف آنے ہی کے لئے کہا ہے —— اور کچھ تو نہیں کہہ آیا ہے؟"

رام خموشی سے آنکھیں جھکا کے بیٹھا رہا۔ اور کچھ نہ بولا۔

نارائینی —— "ارے بول نا؟ ڈاکٹر بابو سے کیا کہہ آیا ہے —— ؟"

رام —— "میں نہیں بتا سکتا —— "

اسی دَوران نرتت کالی نے کمرہ میں آ کر خبر دی کہ ڈاکٹر مریض کو دیکھنے آئے ہیں۔ نارائینی جھٹ سے موٹی چادر اوڑھ کر کروٹ لے کر لیٹ گئی۔ رام اُسی وقت باہر نکل گیا۔ اِس کے بعد ہی ڈاکٹر کو ہمراہ لے کر شیام لال اندر آ گئے۔ نبض وغیرہ دیکھ اور مناسب دوا تجویز کر کے دے کر نارائینی کو مخاطب کر کے ڈاکٹر نیل منی نے کہا —— "بہو تم ہی بولو۔ کیا بخار کا چڑھنا اُترنا ڈاکٹر کے ہاتھ میں ہے۔ تمہارے دیور نے تو مجھے فقط آج ہی کا دِن دیا ہے۔ آج

اگر بخار اُتر گیا تو ٹھیک ہے ورنہ میرے دوا خانہ کو وُہ جلا کر خاک کر دے گا۔"

نارائینی نے بے حد شرمندہ ہو کر کہا ۔۔۔۔۔۔ "وُہ ایسے ہی کہتا پھرتا ہے آپ بالکل فکر نہ کریں ۔۔۔۔۔"

ڈاکٹر ۔۔۔۔۔۔ "سب لوگ جو کہتے ہیں کہ اُس کی ایک بندر فوج ہے اور وُہ لوگ جو کہتے ہیں کر کے ہی دَم لیتے ہیں۔ اِسی سے بڑا خوف محسوس ہوتا ہے بیٹی۔ ہم لوگ تو صرف دَوا دے سکتے ہیں۔ مرض کا اچھا ہونا یا نہ ہونا تو بھگوان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اِس مُعاملے میں تو ہم لوگ بالکل ہی لاچار ہیں۔ تُم خود ہی عقلمند ہو اور اِس بات کو سمجھتی ہی ہو۔"

نارائینی ۔۔۔۔۔۔ "ایسا معلُوم ہوتا ہے کہ یہ شیطان لڑکا ایک دِن ضرُور جیل جائے گا۔ اور ساتھ ساتھ ہمیں بھی وہاں کی ہَوا کھلائے بغیر باز نہ آئے گا۔

آج نیل مَنی ڈاکٹر بابُو نے اپنی خواب گاہ میں رکھے ہُوئے ایک خاص بکس میں چھپائی ہُوئی خالص اور اصلی اور تازی کونین نکال لایا تھا۔ معلُوم ہوتا ہے کہ رام کے خوف کا بھُوت بُری طرح ڈاکٹر بابو کے سر پر سوار ہو گیا تھا۔ واپس جاتے وقت شیام لال اُن کی فیس چار روپے اُن کے ہاتھ پر رکھنے لگا تو زبان نکال کر کانوں پر ہاتھ رکھتے ہُوئے انھوں نے کہا ۔۔۔ "نہ شیام بابو غضب ہو جائے گا۔ میری فیس تو صرف ایک روپیہ ہے۔ میں چار روپیہ کیسے لے سکتا ہُوں؟ زیادہ فیس چارج کرنا میری عادت نہیں۔ پیسہ تو چار دِن کی مایا ہے۔ ڈھلتی دھُوپ کی چھایا ہے۔"

ابھی دو ہی دِن پہلے اِسی جگہ پر نیل مَنی ڈاکٹر نے اُن سے ایک روپے کے دُو رُپے فیس کی صُورت میں چارج کرنے میں ذرا بھی آج کی مانند ہچکچاہٹ ظاہر نہ کی تھی ۔۔ وُہی ڈاکٹر نیل مَنی آج رام کی بدولت سر پہ پاؤں رکھے فوراً دوڑتے چلے آئے۔ اور اپنی فیس بھی چار روپے کے بجائے ایک ہی روپیہ لی۔ اور اِس میں بھی شک نہیں کہ اُنھوں نے دَوا اصلی ہی دی ہو گی۔

کونین کی ایک ہی پُڑیا نے صبح تک نارائینی کا بُخار ہلکا کر دیا۔ اور دو دن ہی میں وُہ تندرست ہو کر پہلے کی مانند اپنی گرہست کی گاڑی کو چلانے لگ گئی۔

تقریباً دو مہینے بعد ایک روز جب نارائینی ندی میں نہا رہی تھی۔ تو ایک عورت نے اُس سے رام کی نئی شیطانی کا ذِکر کیا۔ جسے سُن کر وُہ دِل ہی دِل میں پریشان ہوا۔ جلدی سے نہا کر کمر پر گھڑا رکھ گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ رسوئی گھر میں گھڑا رکھ کر جاتے ہُوئے نرت کالی سے اُس کی مُلاقات ہو گئی۔ اُسے دیکھتے ہی نارائینی نے پُوچھا۔
"بیٹا۔ وُہ بندر کہاں ہے؟"

گھر کے سب افراد اِس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ بندر سے کیا مُراد ہے اور نارائینی کسے بندر کہتی ہے۔

بیٹا نے رام کی طرف اُنگلی سے اِشارہ کرتے ہُوئے کہا ——— "ماں جی چھوٹے بابُو اُس درخت کے نیچے بیٹھے پتنگ بنا رہے ہیں۔"

نارائینی نے رام کو آواز دی ——— "اور رام اِدھر آ۔ تیرے مارے تو ناک میں دم آ گیا ہے۔ تُو نہ گھر میں ہی نہ چین سے بیٹھنے دیتا ہے اور نہ ہی تیری وجہ سے باہر ہی شانتی رہتی ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی تیرا ہی گُن گا رہا ہوتا ہے۔"

نارائینی نے اُس سے پُوچھا ——— "کیوں رے؟ یہ سانترا لوگوں کے کھیت میں کھیروں کی بیل کون برباد کر آیا ہے ———؟"

رام ——— "کیا اُن لوگوں نے مجھے دیکھا ہے؟"

نارائینی ـــــــ "گو اُن لوگوں نے تجھے نہیں دیکھا۔ لیکن میں تو جانتی ہوں ناکہ یہ کِس کی کرتُوت ہے۔ بول کیوں اُن کے کھیروں کا ستیاناس کرایا ہے ـــــــ ؟"

رام ـــــــ "اُس بُڑھیا نے میری بے عزّتی کیوں کی ہے ـــــــ ؟"

نارائینی ـــــــ (غصّہ سے) "بے عزّتی کی بات پیچھے ہو گی۔ میں تیری سب کارستانی جانتی ہوں۔ پہلے یہ بتا کہ تُو نے چوری کیوں کی ـــــــ ؟"

رام نے بے حد غصّہ اور جوش میں بھر کر کہا ـــــــ "چوری کبھی نہیں۔ کیا ایک ٹکڑا کھیرا لے لینے سے کہیں چوری ہوتی ہے ـــــــ ؟"

نارائینی نے اَور بھی بھڑکتے ہُوئے کہا ـــــــ "ہاں ہوتی ہے بندر۔ اِتنا بڑا ہو گیا ہے ابھی تک عقل نہیں آئی۔ یہ بات تو چھوٹا بچّہ بھی جانتا ہے کہ چوری کِسے کہتے ہیں؟ تُو آج کل بڑا خراب ہوتا جا رہا ہے۔ کھڑا رہ آج دِن بھر ایک پاؤں پر یہیں۔ اِسی جگہ۔ آج تجھے ضرور سزا دُوں گی ـــــــ"

اُس مکان میں سب سے چھوٹا گوبند تھا جو رام کا بایاں ہاتھ تھا۔ چوبیس گھنٹے وہ رام کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اَور رام کے سب کاموں میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ رام کے کہنے سے اب تک وہ پتنگ پکڑے بیٹھا تھا۔ لیکن گرما گرمی کی بات سُن کر وہ اُسے چھوڑ ماں کے پاس چلا آیا۔

گوبند نے رام کو اِدھر اُدھر کرتے دیکھ کر جھٹ سے کہا ـــــــ "چاچا اب ٹال مٹول سے کام نہ چلے گا۔ ماں کو سب معلوم ہو گیا ہے اب پاؤں سے اِس طرح کھڑے ہو جاؤ۔" اِتنا کہہ کر اُس نے ایک پاؤں اُٹھا کر کھڑا ہونے کی ترکیب بتا دی۔

رام نے چڑ کر گوبند کے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ اور پیچھے پیٹھ پھیر کر ایک پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

نارائینی ہنسی کو بمشکل دبا کر گوبند کو گود میں اُٹھا کر رسوئی گھر میں چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُس نے آ کر دیکھا کہ رام اُسی طرح ایک پاؤں پر کھڑا سسک سسک کر رو رہا ہے اور بار بار

دھوتی کے پلّو سے آنکھیں پونچھ رہا ہے۔

نارائینی نے کہا ———— "اچھا جا، ہو گیا۔ اب پھر ایسی بدمعاشی نہ کرنا۔"

رام نے کچھ سُنا ہی نہیں۔ غصّہ میں وُہ اِسی طرح ایک پاؤں پر کھڑا آنکھیں پونچھتا رہا ————

نارائینی نے اُس کے نزدیک آکر پیار سے اُس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگی۔ لیکن رام نے جھٹک کر اُس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ نارائینی پھر ایک بار اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ لیکن پہلے ہی کی مانند اِس بار بھی اُس کا ہاتھ جھٹک دیا اور باہر بھاگ گیا۔

قریب ایک گھنٹہ بعد نرت کالی اُس کی کھوج میں نکلی۔ اُس نے دیکھا کہ رام برآمدے کے ایک کونے میں چُپ چاپ بیٹھا ہے۔ اُس نے کہا ———— "چھوٹے بابو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو سکول جانے کا ہوش نہیں۔ کچھ خبر بھی ہے کہ کیا بج چکا ہے؟ چلئے، ماں جی ناراض ہو رہی ہیں۔"

رام نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایسی شکل بنائی کہ جیسے اُس کی کوئی بات سُنی ہی نہیں۔ اور اُسی طرح سے اُس کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے بیٹھا رہا۔

اُسے کچھ جواب دیتا نہ پاکر نرت کالی اُس کے نزدیک آئی اور بولی ———— "چھوٹے بابو ماں جی نے کہا ہے کہ اسکول کا وقت ہو گیا ہے۔ جلدی نہا دھو کر کھانا کھا لیجئے ————"

رام نے اُسے لال لال آنکھیں دِکھا کر جھاڑتے ہوئے کہا ———— "تو چلی جا یہاں سے اپنی صُورت بھی مت دِکھا۔"

نارائینی ———— "لیکن ماں جی نے کیا کہا ہے۔ اُسے بھی سُنا ہے آپ نے؟"

رام ———— "میں کچھ بھی نہیں سُننا چاہتا۔ نہ تو آج نہاؤں گا اور نہ کھاؤں گا۔ میں کچھ بھی نہیں کروں گا آج ————"

نارائینی ———— "اچھی بات ہے میں ابھی جاکر ماں جی سے کہتی ہوں۔

اِتنا کہہ کر نرت کالی واپس جانے کے لئے مُڑی۔

رام فوراً اُٹھا اور گندے جوہڑ میں ایک ڈبکی لگا کر اُسی طرح بھیگے کپڑے اور بھیگا سر لئے آنگن میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اِس بات کی خبر فوراً ہی نرت کالی نے نارائینی کو پہنچائی۔ وہ بے چاری بے چین ہو اُٹھی۔ فوراً رسوئی گھر سے نکل کر آنگن میں آئی اور اپنے آنچل سے اُس کا بدن اور سر پونچھتی ہوئی رام سے کہنے لگی۔

"ارے پگلے یہ تُو نے کیا کیا۔ اُس گندے جوہڑ میں تو کوئی پاؤں بھی نہیں دھوتا ہے اور تُو سر اور پاؤں تک نہا آیا۔ بیمار پڑ جائے گا تو میری ہی جان پر آفت آئے گی نا؟" اِتنا کہہ کر اُس نے رام کے بھیگے کپڑے اُتارے۔ نرت کالی سے سُوکھے کپڑے لے کر پہنا دیئے بڑے دُلار سے وہ اپنے ساتھ چوکے میں لے گئی۔ اور چوکی پر بٹھا کر اُس کے سامنے بھوجن پروس کر رکھ دیا۔ لیکن رام نے تھالی میں ہاتھ تک نہ لگایا۔ اور پتھر کی مورتی کے مانند سر جھکائے بیٹھا رہا۔

نارائینی اُس کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ اُس نے بڑے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——— "رام! تُو تو بڑا راجہ بیٹا ہے نا؟ ابھی تُو اپنے ہاتھ سے کھالے۔ رات میں خود تجھے اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی۔ تو خود دیکھ لے ابھی میری رسوئی تیار نہیں ہوئی ہے۔ صبح سویرے کے گئے ہوئے تیرے بھیّا کا آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اب تک کھانا تیار نہ ہونے سے مجھ پر ناراض ہوں گے نا؟ تو کھالے بیٹا اب ———!"

رام بڑے تابعدار بچّے کے مانند بھابھی کے اِتنا کہنے پر چُپ چاپ کھانا کھا کر اُٹھ گیا۔ اور فوراً کوٹ پہن اور بغل میں بستہ دبا سکول کو روانہ ہو گیا۔

نارائینی کی یہ سب باتیں نرت کالی دیکھ رہی تھی۔ رام کے چلے جانے کے بعد کہنے لگی ——— "ماں جی تمہاری ہی وجہ سے یہ رام اِتنا بگڑ گیا ہے۔ اِتنا بڑا ہو گیا ہے لیکن ابھی تک گود میں بیٹھ کر تمہارے ہاتھ سے کھانا کھانے کی ضد کرتا ہے۔"

نارائینی نے ہنس کر کہا ——— "اگر میں اُس سے رات کو کھلا دینے کی بات کہتی

تو وُہ اُبھی ہرگز نہ کھاتا۔ چاہے سارا دِن گڑگڑاتا۔ یُونہی گردن جھکائے بیٹھا رہتا۔"
نرتؔ کالی ــــــ" نہ کھاتا تو نہ سہی۔ جب پیٹ جلتا تو خود ہی مانگ لیتا۔ اتنا بڑا ہو گیا لیکن ......"

نرتؔ کالی کی باتیں سُن کر نارائینی بے چین ہو اُٹھی۔ اور کہنے لگی ــــــ" تم لوگ تو اُس کی عمر ہی دیکھتے ہو۔ ابھی وُہ بچہ ہی ہے۔ بڑا ہو گا تو سمجھ جائے گا۔ تب تو خود ہی اُسے یہ جھپا کرنے میں شرم محسوس ہو گی نہ کبھی گود میں بیٹھنے کا ہی ذکر کرے گا نہ کھِلانے کو ہی کہے گا۔"

نرتؔ کالی نے اندر ہی اندر ناراض ہو کر کہا ــــــ" ماں جی میں تو بھلے ہی کو کہتی ہُوں۔ نہیں تو کیا مجھے اُس سے کوئی دشمنی ہے؟ اگر بارہ تیرہ سال کی عمر میں شعور اور عقل نہ آئی تو کیا بُوڑھے ہونے پر آئے گی۔ اُبھی سے ہی آہستہ آہستہ اُس کی عادتیں نہ سُدھاری گئیں تو بعد میں پچھتانا ہو گا۔"

اِس دفعہ نارائینی کا پارہ گرم ہو گیا۔ وُہ رامؔ کو بے حد چاہتی تھی۔ دوسروں کی بات کا تو کہنا ہی کیا۔ وُہ شیام لال تک کو بھی رامؔ کو کچھ نہ کہنے دیتی تھی۔ اِس بات پر وُہ نرت کالی سے ناراض ہُوئی۔ کہنے لگی ــــــ" سب آدمیوں میں شعُور اور عقل آنے کا کوئی مقررہ وقت نہیں ہے۔ کوئی تو دو تین سال پہلے فرائض اور ذمہ داریوں کو سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اور کسی کو دو تین سال کی دیر لگتی ہے۔ چاہے اُس میں عقل ہو یا نہ ہو کسی کو اِس سے کیا لینا دینا ہے۔؟ میرا لڑکا ہے میں خود اُس سے سمجھ لُوں گی۔ پھر تم کیوں اُس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے رہتے ہو؟"

نرتؔ کالی ــــــ" یہ تو آپ ہی کی غلطی ہے۔ اُس کی شرارتیں کس قدر بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ تو آپ سے بھی چھپا نہیں۔ گلی محلّے والے بھی کہتے ہیں کہ یہ سب آپ ہی کی وجہ سے ہے۔"

نارائینی ــــــ" گلی محلّے کے لوگ تو لاڈ ہی دیکھتے ہیں اور سر چڑھا لیا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اُس کو شرارتوں کی کس طرح سزا دیتی ہُوں اِس پر کسی کی آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ پھر تو تو پاس پڑوس کی نہیں ہے۔ تُو نے خود ہی دیکھا ہے کہ صبح گھنٹہ بھر وُہ ایک پاؤں پر کھڑا رہتا رہا

ہے۔ اِس کے بعد اُس جوہڑ میں جاکر نہا آیا تھا۔ اگر کہیں بخار نے آدبوچا تو مجھے ہی جھیلنا ہوگا گلی محلے والے جھانکنے بھی نہ آئینگے۔ تو ہی بتا کہ کیا اتنی سزا کم تھی جو تیرے کہنے پر اُسے بھوکا ہی سکول بھیج دیتی؟ اب تو یہ گھر اور باہر کی چخ چخ برداشت نہیں پاتی۔"

اِتنا کہہ کر نارائینی خاموش ہو گئی۔ رات بھی انہی باتوں کو لے کر شیام لال سے گھنٹوں تکرار ہو چکی تھی۔ وُہ اِس وقت بہت دُکھی تھی۔ پھر اِسی بات کے اُٹھ جانے پر اُسکے دِل کا درد آنکھوں کی راہ سے اُمڈ پڑا اور نارائینی اپنے آنچل سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ برکت کالی کو اِس بات کا خیال نہ تھا کہ اِنہی باتوں کو لے کر وُہ رات کو بھی دُکھی ہو چکی ہے، نہیں تو آج وُہ اِس مسئلہ پہ گفتگو ہی نہ کرتی۔ وُہ کافی عرصہ سے اِس گھر میں کام کرتی چلی آ رہی تھی۔ نارائینی اُس کے سامنے ہی بہو بن کر اِس گھر میں آئی تھی اور وُہ اِس کو اپنی بیٹی ہی کی مانند پیار اور محبت کی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ نارائینی کے اِس طرح رونے سے اُس نے شرمندہ ہو کر کہا ——— "ماں جی آپ رو کیوں رو رہی ہیں؟ میں نے آپ کو دُکھی کرنے کی غرض سے تو ایسا نہیں کہا تھا۔ گاؤں کے سب لوگ برابر ٹوکتے ہیں اِس لئے میں کہہ رہی تھی کہ ابھی سے ہی روک تھام کرنے کی ضرورت ہے نہیں تو لڑکے کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ آپ میری باتوں کا کچھ خیال نہ کریں"۔

نارائینی نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا ——— "سب آدمیوں کو بھگوان ایک جیسا نہیں بناتا۔ رام تھوڑا شرارتی ہے۔ اِسی لئے سب کی باتیں چپ چاپ سُن لیتی ہوں۔ لیکن لوگ تو دُوسروں کی بُرائی ہی دیکھنا جانتے ہیں۔ آخر یہ دُنیا والے چاہتے کیا ہیں؟ میں اُس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر ندی میں بہادوں؟ پھر شاید اُن لوگوں کو صبر آجائے"۔ اِتنا کہہ کر نارائینی بغیر کسی جواب کا انتظار کئے ہی کمرہ میں چلی گئی۔

دِل ہی دِل میں سوچتی ہوئی برکت کالی خود سے کہنے لگی ——— "میں نہیں جانتی تھی کہ ذرا سی بات کہنے پر ماں جی بات کو اِتنا طُول دینگی۔ بڑے ہی تعجب کی بات ہے کہ اتنی سمجھدار اور تجربہ کار ہو کر ماں جی اِتنی سی بات کو بھی نہیں سمجھیں۔ رہی سزا کی بات تو وُہ میں بھی دیکھ رہی

ہُوں۔ لڑکا ایک منٹ ایک پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ ماں جی نے سارا گھر سر پہ اُٹھالیا۔ اُسی جگہ کھڑی بڑت کالی اور نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی اور کہتی رہی۔

دِن بیت گیا اور شہنشاہ فلک آفتاب جہاں کو منوّر کرنے کی ذمّہ داری ٹمٹماتے دیپک کو سونپ کر خود اپنی دُنیا میں چلا گیا۔

صُبح رامؔ تو کھانا کھا کر جلدی چلا جاتا تھا سکول کو اور شیام لال لکے جانکے کا مُنی دیر بعد کچہری سے واپس آتے تھے۔ اِسی لئے کھانا کھانے میں انہیں کافی دیر ہو جاتی تھی۔ اِس طرح فقط رات کو ہی دونوں بھائیوں کو ساتھ ساتھ کھانے کا موقعہ ملتا تھا۔ لیکن رامؔ اپنے بھیّا کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا ذرا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ وُہ نارائنی کے ہی ساتھ کھاتا تھا۔ آج دیدہ دانستہ اُس نے دونوں بھائیوں کا کھانا ایک ساتھ ہی پرُوس دیا۔ گھر میں گھستے ہی رام کی نظر اِس پر پڑی اور وُہ بھڑک اُٹھا۔ "جاؤ میں کھانا نہیں کھاؤں گا ہرگز ہرگز نہیں کھاؤں گا۔

نارائنی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ——— "تب جا کر سورہ ———"

اپنی بھابھی کا کورا جواب سُن کر وُہ حیران و ششدر رہ گیا۔ فوراً ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن وُہ کھانے نہیں بیٹھا صرف چُپ چاپ کھڑا رہا۔

رسوئی گھر میں شیام لال کو آتے دیکھ کر وُہ دُوسرے دروازے سے ہوا کے مانند باہر نکل گیا۔ وُہ اُپنے بھیّا کا سامنا بہت کم کرتا تھا اور اکثر وہاں سے ہٹ جاتا تھا۔ شیام لال اپنی تھالی پر بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ کھاتے ہُوئے بولے ——— رامؔ نے کھانا کھالیا ہے کیا؟"

نارائنی نے کہا ——— "وہ آج میرے ساتھ کھائے گا۔"

شیامؔ کے کھانا کھا کر چلے جانے کے بعد رامؔ ایک مُٹھی راکھ لے کر باورچی خانہ کے اندر آیا اور کہنے لگا ——— "میں کِسی کو بھی نہیں کھانے دُوں گا۔ سب کے کھانے میں راکھ ڈال دُوں گا ———

نارائینی ـــــــ "راکھ ڈال کر تو دیکھ میں تیری کیسی پوجا کرتی ہوں۔"

رام ـــــــ "کیا پوجا کرے گی؟ تم نے خود ہی صبح مجھے پھسلا کر بھات کھلا دیا تھا اور اب اس وقت کہتی ہو کہ پوجا کروں گی۔"

نارائینی ـــــــ "تو نے کھایا کیوں؟"

رام ـــــــ "تم ہی نے کہا تھا کہ رات کو ـــــــ"

نارائینی ـــــــ (قطع کلام کرتے ہوئے) "اتنا بڑا ہو گیا دوسرے کے ہاتھوں کھاتے شرم نہیں آتی؟"

رام نارائینی کی باتوں کو سُن کر حیران رہ گیا اور بولا ـــــــ "دوسرا کون؟ تمہیں نے تو صبح کھلانے کو کہا تھا۔ کیا تمہیں یاد نہیں ہے؟"

نارائینی نے کوئی بحث نہ کرتے ہوئے کہا ـــــــ "اچھا جا راکھ پھینک دے اور ہاتھ دھو کر آ۔ اتنا کہے دیتی ہوں کہ پھر کبھی کھلانے کو نہ کہنا۔"

جس وقت نارائینی رام کو کھانا کھلا رہی تھی بغیر کسی مطلب کے ہی پنیتا باورچی خانہ کے دروازے سے ہوتی ہوئی اندر کا سب حال دیکھتی ہوئی باہر برآمدے میں نکل گئی۔

نارائینی نے بھی اُس کو جاتے ہوئے دیکھا۔ لیکن کچھ خیال نہ کیا۔ اُس نے رام کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ بڑے پیار سے کہا ـــــــ "لوگوں کی باتیں سُنتے سُنتے تو میں تنگ آ گئی ہوں میرے کان پک گئے ہیں رام۔ کیا تو کبھی بھی اچھا لڑکا نہ بنے گا؟ اب تو لوگوں کی باتیں مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔"

رام نے منہ کا نوالہ نگل کر کہا ـــــــ "کون کہتا ہے؟ جو میرے پیچھے بے کار پڑے ہیں اُن لوگوں کا نام تو ذرا بتاؤ۔"

نارائینی نے بڑے غصہ سے کہا ـــــــ "ہاں میں تجھے اُن لوگوں کا نام بتا دوں تاکہ پھر تو شرارت کر سکے۔ میں صرف یہی چاہتی ہوں کہ تو اپنی شرارتوں سے باز آ جائے۔"

رام کو بھابھی کے لہجے میں کچھ دُکھ اور غم محسوس ہوا۔ اُس نے نارائینی کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا ــــــ "بھابھی تم ذرا بھی فکر نہ کرو۔ تم جو بھی کرنے کو کہو گی میں وہی کروں گا"

نارائینی کی ماں کا نام دِگمبری تھا۔ اُس کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اُس کی ایک لڑکی اور تھی جس کا نام سردُھنی تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد سُسرال میں کسی کے نہ رہنے پر دِگمبری اپنے بھائی کے یہاں چلی آئی اور اپنے بھائی کی گرہستی کو سنبھالا۔ اُس کے بھائی کی بیوی کو مرے کئی سال ہو چکے تھے اور گھر میں اِس طرح کسی کے نہ رہنے پر اُنھوں نے اسے اپنے پاس بُلالیا۔ اِس طرح اپنے بھائی کے مکان میں اپنی دس سالہ لڑکی سردُھنی کو لے کر دِگمبری اپنے دِن کاٹ رہی تھی۔ لیکن قُدرت کو یہ بھی منظور نہ تھا۔ دِگمبری بھائی کے پاس بھی زیادہ دن نہ رہ سکی۔ کیونکہ اُس کے بھائی کو بھی پیغامِ اجل آگیا۔ تب تو اُس کے لئے اپنی بیٹی نارائینی کو چھوڑ کر اور کوئی اپنا سہارا دینے والا نہ تھا۔ اِس لئے اور کوئی ذریعہ نہ دیکھ کر اپنے دُکھ کی خبر اُس نے نارائینی تک پہنچائی۔

نارائینی نے رات کے کھانے کے وقت شیام لال سے اپنی ماں پر آئی ہُوئی مُصیبت کا ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ اب اُس کو چھوڑ اور کوئی دُوسرا اُس کا سمبندھی بھی نہیں بچا ہے۔ جس سے وہ اِس مُصیبت کے وقت سہارے کی اُمید کر سکے۔ علاوہ ازیں ماں کے آجانے سے گرہستی کے کام کاج میں بہت کچھ مدد بھی مِل سکے گی۔ شیام لال نارائینی کی باتوں سے متفق ہو گیا اور کہنے لگا کہ کل سویرے کسی کو بھیج کر اُنہیں بُلوا لیا جائے گا۔"

دُوسرے دِن دوپہر تک دِگمبری اپنی لڑکی سردُھنی کو لے کر نارائینی کے گھر آ پہنچی آتے

ہی اُس کی نظر رام پر پڑی۔ جانے کیسے عجیب طریقے سے مُنہ بنا کر اُس رام کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہُوا جیسے کہ وُہ رام کو پھُوٹی آنکھوں سے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ اُس کے اِن جذبات کو دو تین دِن ہی میں گھر کے دیگر سب لوگ بھی سمجھ گئے۔

کئی روز بعد کی بات ہے کہ رام ایک پیپل کے درخت کی ٹہنی لے کر گھر میں آیا۔ آنگن میں ایک گڑھا کھود کر اُس نے بڑی کاوِشوں سے اُس ٹہنی کو لگایا۔ دِگمبری رسوئی گھر کے دروازہ میں بیٹھی رام نام کی مالا جپ رہی تھی۔ مالا گھُماتے گھُماتے وُہ رام کے کرتُوت بھی دیکھے جا رہی تھی۔ لیکن چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اُسے رام کے یہ چھچھن ذرا بھی پسند نہیں آ رہے تھے۔ آخر کار جب اُس سے نہ رہا گیا تو بڑے تیکھے لہجے میں کہہ کی ـــــ "اُس درخت کا کیا ہوگا رام"؟

رام بولا ـــــ "یہ پیپل کی ٹہنی کچھ دِن بعد بڑھ کر ایک بہت بڑا درخت بن جائے گی۔ اور پھر وُہ درخت آنگن میں چھایا کرے گا۔ ہمارے ماسٹر جی نے بتایا ہے کہ پیپل کے درخت کی چھاؤں بڑی ٹھنڈی ہوتی ہے"۔

پھر وہ گوبند اور بھولا سے مخاطب ہُوا ـــــ "گوبند! تو جا پانی لے آ۔ اِس درخت کو پانی دے کر سینچوں گا۔ اور بھولا! تو جا چھوٹے چھوٹے دیکھ کر بانس تو لے آ۔ اُسے کاٹ کر اِس کے چاروں طرف باڑ لگاؤں گا نہیں تو اپنی گائے اور بچھڑا ہی اِسے کھا جائیں گے"۔

رام کی باتیں سُن کر دِگمبری سر سے لے کر پاؤں تک جل بھُن گئی۔ چڑھ کر بولی ـــــ "یہ آنگن میں پیپل کا درخت۔ ہے بھگوان۔ ایسی اَنوکھی بات تو میں نے آج تک نہ سُنی نہ دیکھی۔

رام نے اُس کی بات سُنی تک نہیں۔ اِسی دَوران اپنے اوقات کے مُطابق گوبند چھوٹے سے لوٹے میں پانی بھر کر لے آیا۔ اُس کے ہاتھ سے لوٹا لے کر رام بڑے پیار سے

بولا ــــــ "ارے پگلے! اتنے ذرا سے پانی سے کیا بنے گا۔ اچھا تو یہاں کھڑا رہ میں خود پانی لے کر آتا ہوں۔

اس طرح گوبند کو کھڑا کر کے وہ خود پانی لینے چل دیا۔ چھوٹی بالٹی میں کئی دفعہ پانی لا کر اس نے اس درخت کو بالکل تر بتر کر دیا۔ ضرورت سے زیادہ پانی چھوڑ دینے سے سارے آنگن میں کیچڑ ہو گیا۔

نارائینی کے ندی سے نہا کر آنے سے پہلے ہی درخت لگانے اور اسے سینچنے کا کام ختم ہو چکا تھا۔ صرف اس کے چاروں طرف باڑھ ہی لگانا باقی تھی۔ اور بھولا ابھی تک بانس لے کر آیا نہیں تھا۔

دگمبری اب تک ویسے ہی جل رہی تھی۔ اس کے سامنے ہی اتنا بڑا ڈرامہ شروع بھی ہوا اور ختم بھی ہو گیا۔ وہ بھی اس کی مرضی کے خلاف اور وہ کچھ بھی کر نہ سکی۔ اسے وہ کیوں کر برداشت کر سکتی تھی۔ اسی وقت نارائینی بھیگے کپڑے پہنے اور کمر پر بھاری گھڑیا رکھے مکان میں داخل ہوئی۔ ٹھیک وقت پر نارائینی کو آتی دیکھ کر دگمبری چلائی ــــــ "دیکھ نارائینی آنکھ کھول کر اپنے لاڈلے دیور کے کرتوت دیکھ۔ ٹھیک آنگن کے بیچ پیپل کا درخت لگا کر کہتا ہے کہ ٹھنڈی چھایا ہو گی اور اس طرف دیکھ بدمعاش بھولا کے کرتوت کتنا بڑا بانس کا جھاڑ لے کر آ رہا ہے۔ اس پیپل کے چاروں طرف حفاظتی باڑھ لگائی جائے گی۔"

نارائینی نے دیکھا۔ سچ مچ بھولا بانس کا ایک بڑا سا جھاڑ کھینچتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ بھولا کی عمر بھی رام کی عمر کے لگ بھگ ہی ہو گی۔ لیکن وہ بہت سیدھا تھا۔ پورا بھولا ہی تھا۔ اس تمام کھیل کو دیکھ کر نارائینی کی ہنسی روکے نہ رکی۔ ایک طرف ماں کا ناجائز غصہ اور دوسری طرف رام کا پاگل پن دونوں ہی اس کی ہنسی کے سبب تھے۔ ہنستے ہوئے وہ رام سے بولی ــــــ "اس بیچ آنگن میں پیپل کا درخت کیا ہو گا رے پاگل؟"

رام نے جیسے بھابھی کے ناسمجھی پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ــــ "ارے بھابھی تم کیا۔ اتنا بھی نہیں جانتیں۔ یہ چھوٹا سا پیپل کا درخت بڑا ہو کر بڑا گھنا ہو جائیگا اور کیا ہی ٹھنڈی اور پیاری چھایا ہو گی اس کی! پھر یہ چھوٹی سی ڈال دیکھ رہی ہو نا۔ ــــ ــــ اسی دوران گوبند کو اس ڈال کی طرف اُنگلی دِکھاتا ہوا دیکھ کر اُس نے منع کرتے ہوئے کہا ــــ "ارے گوبند اُنگلی نہیں دِکھاتے اِسے" ــــ (نارائینی سے) ــــ "تو بھابھی اِس ڈال پر جب یہ موٹی اور بڑی ہو جائے گی گوبند کے جھولنے کے لئے جھولا ڈالوں گا۔" بھولا اب تک رام کے نزدیک آ پہنچا تھا جسے دیکھتے ہی رام بولا ــــ "او بھولا ذرا اُونچا پیڑ اپنا ما ہو گا نہیں تو کہیں ایسا نہ ہو اپنی کالی گائے گردن بڑھا کر درخت کو صفاچٹ کر جائے۔ اچھا لا مجھے کلہاڑی دے دے میں خود کاٹوں گا۔ یہ کام ذرا مشکل ہے تجھ سے نہ ہو گا۔" اِس طرح رام نے بھولا سے کلہاڑی لے کر کھٹ کھٹ ٹھک ٹھک بانس کاٹنا شروع کر دیا۔

نارائینی اِن کا یہ پاگل پن دیکھ کر ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر ہو گئی لیکن کچھ نہ کہہ ہنستی ہوئی کمر کے پڑے گھڑے کو رسوئی گھر میں رکھنے چلی گئی۔

دِگمبری نے دیکھا کہ نارائینی نے رام سے کچھ کہا تک نہیں صرف ہنس کر ٹال دیا ہے۔ اب تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ مارے غصّہ کے اُس کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں اور اُس نے اِسے اپنی توہین سمجھا ــــ اُس سے کچھ کہا تک نہیں ــــ صرف ہنس کر ہی ٹال دیا ــــ "تب کیا یہاں پر پیپل کا درخت لگ کر ہی رہے گا؟"

نارائینی ــــ "ماں! آپ اِتنا پریشان کیوں ہوتی ہیں؟ اِتنا بڑا درخت اِسی پاگل پنے سے ہوتا ہے۔ ارے اُس ٹہنی میں کیا جڑ مول ہے جو گھڑا گھڑا پانی ڈالنے سے بڑھ کر اُونچا چھایہ دار درخت بن جائے گا۔ آپ دیکھتی تو رہیے۔ وہ ٹہنی تو کل ہی سوکھ کر گر پڑے گی۔"

لیکن دِگمبری کو اِن باتوں سے تسلّی نہ ہوئی۔ وُہ جیسے رآم کی ذرا سی بات بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ کہنے لگی ــــــ "نارآیئنی اگر بھلا چاہتی ہے تو اِسی وقت اِسے اُکھاڑ کر پھینک دے۔ او۔ وُہ سُو کھے گا کیا؟"

نارآیئنی نے اُس کی باتیں سُن کر بڑی بے چین ہوکر کہا ــــــ "ایسا کرنے سے تو اُبھی غضب ہو جائے گا۔"

دِگمبری ــــــ "اِس مکان پر اکیلے اُسی کا حق ہے؟ جو وُہ چاہے گا کرے گا یہاں تک کہ بیچ آنگن میں بغیر کسی سے پُوچھے ہی پیپل کا درخت لگائے گا۔ کیا تُم لوگوں کی نگاہ میں اُس نے کچھ نہیں کیا۔ میرے گوبند کا بھی یہاں کچھ حق نہیں ہے۔ پھر پیپل کے درخت پر باز۔ کوا۔ چیل وغیرہ آکر تمام آنگن میں گندگی پھیلائیں گے۔ ایسا ہونے پر تو نارآیئنی میں یہاں ایک پل بھی نہ رہ سکوں گی۔ آخر تُم کس وجہ سے اُس سے خوف کھاتے ہو۔ اگر یہ گھر میرا ہوتا تو دیکھتی کہ وُہ کتنا بڑا شیطان ہے۔ ایک ہی دِن میں اُسے سیدھا کر کے رکھ دیتی۔ تُو ہی اُس کی سبھی باتیں برداشت کر لیتی ہے۔ اِسی وجہ سے وُہ سر پر چڑھا ہُوا ہے۔ میرے اِختیار میں ہوتو ــــــ"

نارآیئنی اِس سے زیادہ برداشت نہ کرسکی۔ رآم کے خِلاف اِتنا ہی کہنا کافی دینے پر ہی نارآیئنی اپنی ماں کی گندی اور ناپاک رُوح کو سمجھ چُکی تھی۔ اُس دِن بزت کالی کے ذرا سا کہنے پر ہی نارآیئنی کی آنکھوں سے گنگا جمنا کی دھاریں بہہ نکلی تھیں لیکن دِگمبری اس کی ماں تھی۔ اُس کے تئیں کچھ اُبھی کہنے کو اس کا منہ نہ کھُلا۔ کچھ دیر چُپ رہ کر اپنے چہرے پر زبردستی مُسکراہٹ لاتے ہُوئے بولی ــــــ "ماں وُہ تو بچہ ہے اور پھر ... بھی اِتنی عقل ہی کہاں ہے۔ عقل ہونے سے کیا کوئی اپنے آنگن میں پیپل کا درخت لگاتا ہے؟ آپ دو دِن ٹھہر کر دیکھئے تو وُہ خود ہی اُسے پھینک دے گا۔"

دِگمبری ـــــ "ارے وُہ کیا پھینک دے گا۔ میں ہی نہ اُس ٹہنی کو درخت بننے سے پہلے ہی توڑ کر پھینک دُوں گی۔"

نارآئینی ـــــ "نہیں ماں نہیں۔ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہُوں کہ آپ ایسا نہ کریئے گا۔ آپ اُسے نہیں جانتیں۔ مجھے چھوڑ کر اُس کو چھُونے کی ہمّت اُس کے بھیّا بھی نہ کرینگے۔ کم سے کم آج کا دن تو گُزر جانے دیجئے۔"

رام کی باتوں کے آگے دِگمبری کی بات نہ رکھی جائے یہ وُہ کیسے برداشت کر سکتی تھی؟ رام کو دیکھتے ہی جیسے اُس کا خون کھول اُٹھتا تھا۔ اُس نے بڑی نا بے چینی کا اظہار کرتے ہُوئے کہا ـــ "جا پہلے تُو کپڑے تو بدل لے۔"

اُس وقت دِگمبری اپنی توہین کو پی سی گئی۔ لیکن جو آگ اُس کے دل میں سُلگ چکی تھی وُہ آسانی سے ٹھنڈی ہونے والی نہ تھی۔

دوپہر کو نارآئینی گھر کے دیگر کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے کمرہ میں بیٹھی تکیہ کے غلاف سی رہی تھی۔ اُسی دوران نرتّ کالی نے آکر اسے خبر دی کہ بڑی ماں جی نے چھوٹے بابُو کا درخت اُکھاڑ کر پھینک دیا ہے اور وُہ سکُول سے آکر اپنا درخت نہ دیکھے گا تو بہت بڑا ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہو گا۔" نارآئینی نے نرتّ کالی کی اِتنی ہی بات سُن کر فوراً باہر آکر دیکھا۔ سچ مُچ رام کا درخت آنگن میں نہیں تھا۔

اُس نے اپنی ماں کو وہاں دیکھ کر پُوچھا ـــــ "ماں رام کا درخت کیا ہُوا ـــــ؟"

دِگمبری نے عجیب سا مُنہ بنا کر ایک طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا ـــ "وُہ دیکھ۔" نارآئینی نے نزدیک جا کر دیکھا۔ وُہ درخت صرف اُکھاڑا ہی نہیں گیا تھا بلکہ بُری طرح توڑ مروڑ کر پھینک دیا گیا۔ ایک پتّہ بھی اُس ٹہنی کا ثابت نہ بچا تھا نارآئینی کو اپنی ماں کا سیاہ دل صاف دِکھائی دے گیا لیکن خموش رہی اور چُپ

چاپ اُس درخت کو اُٹھا کر باہر پھینک آئی۔ تاکہ رام اُسے نہ دیکھ سکے۔ وہ چُپ چاپ آ کر اپنے کام میں پھر سے مصروف ہو گئی۔

سکُول سے آ کر رام نے سب سے پہلے اپنی نظر اپنے درخت پر ڈالی اُسے وہاں نہ دیکھ کر رونا پیٹنا اور چلّانا شروع کر دیا۔ اپنی کتاب وغیرہ آنگن میں پھینک کر وہیں سے چلّا کر اپنی بھابھی کو آوازیں لگانے لگا ——— "بھابھی او بھابھی۔ میرا درخت کہاں ہے؟"

نارائینی نے غور آ رسوئی گھر سے نکل کر کہا ——— "بتاتی ہُوں۔ پہلے ادھر تو آ ———"

رام ——— "میں نہیں آتا۔ میرا درخت کہاں ہے؟"

نارائینی ——— "میں کہتی ہُوں اِدھر آ نا؟ بتاتی ہُوں۔"

رام کے قریب آتے ہی وُہ اُس کا بازو تھام کر رسوئی گھر میں لے گئی اور اپنی گود میں بٹھا کر اُس کے سر پر پیار کے ساتھ ہاتھ پھیرتے ہُوئے بولی ——— "ارے پاگل منگوا کو کیا کوئی اپنے آنگن میں بیل کا درخت لگاتا ہے؟"

رام نے اُس کی بات بڑی دلچسپی سے سُنتے ہُوئے کہا ——— "کیوں بیل منگل کو، درخت لگانے سے کیا ہوتا ہے؟"

نارائینی نے ہنستے ہُوئے کہا ——— "اُس سے گھر کی بڑی بہو مر جاتی ہے۔"

رام یہ سُن کر سناٹے میں آ گیا۔ لیکن اُسے یقین نہ ہُوا کہنے لگا ——— "جاؤ بھابھی جھُوٹ بات ہے۔"

نارائینی ——— "نہیں رے جھُوٹی بات نہیں ہے۔ اگر تجھے یقین نہ ہو تو پترا دیکھ لے۔"

رام ——— "لاؤ وُہ کھاؤ پترا۔"

اچانک پترا دیکھنے کی بات سُن کر وہ گھبرا گئی۔ لیکن خود کو سنبھال کر بولی ـــــ "تجھے پترا دیکھنا آتا بھی ہے؟ جو تو پترا دیکھے گا۔ پھر کون بُدھ منگل کو پترا دیکھتا ہے؟ اس کے علاوہ کہیں اتنی معمولی سی بات پر کوئی پترا دیکھتا بھی ہے؟ یہ تو بھولا کو بھی معلوم ہوگا۔ جا تو ابھی اُسے بُلا کر لا۔ میں ابھی پوچھ دیتی ہوں۔"

اتنی بڑی بات معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اُس نے اپنی بڑی بے عزتی محسوس کی۔ ماں کے مانند بھابھی کے گلے میں اپنی دونوں باہیں ڈال کر کہنے لگا ـــــ "ارے یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ اچھا اُسے پھینک دینے میں تو کوئی حرج نہیں ہے نا؟"

اس کے جواب میں نارائینی نے بڑے پیار سے سر ہلا کر کہا۔ اُس کی دونوں آنکھیں جذبات کی شدت سے بھر آئیں۔ کہنے لگی ـــــ "اچھا رام اگر میں مر جاؤں تو تو کیا کرے گا ـــــ؟"

رام نے فوراً بھابھی کے مُنہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ـــــ "نا بھابھی ایسا نہیں کہتے ـــــ"

نارائینی نے اُس سے چھپا کر اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا ـــــ "ارے بُڑھیا ہو گئی ہوں کیا اب نہیں مروں گی؟"

رام نے جیسے اس دفعہ نارائینی کی ہنسی کی بات سمجھ لی۔ کہنے لگا ـــــ "بھابھی تم بُڑھیا ہو؟ نہ تو تمہارا کوئی دانت ٹوٹا ہے۔ اور نہ کوئی بال ہی سفید ہوا ہے؟"

نارائینی ـــــ "بال نہ سفید ہوئے ہی۔ لیکن میں تو جا کر ایک دن ندی میں ڈوب مروں گی یا پھر کہیں چلی جاؤں گی؟"

رام ـــــ "کیوں بھابھی؟"

نارائینی ـــــ "تیرے ہی مارے تو۔ میری ماں سے دن رات جھگڑا رہتا ہے ایک دن بھی چھوٹی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ کسی دن جب میں چپ چاپ چلی جاؤں گی

اور پھر لوٹ کر نہ آؤنگی تب پتہ چلے گا تمہیں"۔

اِس پر رآم کو یقین تو نہ ہُوا۔ لیکن پھر دِل ہی دِل میں کچھ گھبرا کر کہا ـــــ "اچھا بھابھی۔ مَیں اُن سے کچھ بھی نہ کہوں گا۔ لیکن وُہ کیوں میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہیں"

نارآئینی ـــــ "اُنہیں کہنے دیا کر۔ وُہ میری ماں ہیں۔ اَور تیری بھی تو بڑی ہیں۔ جس طرح تُو مجھ سے پیار کرتا ہے اُسی طرح اُن سے پیار کیا کر۔"

رآم نے یہ سُن کر اپنی بھابھی کے آنچل میں اپنا مُنہ چھُپالیا۔ اِسی محبت بھرے آنچل کی اوٹ میں اُس نے اپنے بچپن کے بارہ سال ہنستے کھیلتے گذارے تھے۔ اب اِتنی بڑی غلطیات۔ جیسے اُس کا دِل کبھی برداشت نہیں کر سکتا کیسے اُپنی زبان پر لاسکتا تھا یہ بالکل ناممکن تھا۔ اِسی لئے اُس نے اپنا مُنہ اُسی آنچل میں چھُپالیا۔ اَور نارآئینی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

نارآئینی رُندھے گلے سے بولی ـــــ "مُنہ چھُپانے سے کیا ہوگا رے؟"

ٹھیک اُسی وقت دِگمبری جو برابر ایسے موقعوں کی تلاش میں گھُومتی رہتی تھی رسوئی گھر کے دروازے پر آئی اَور مخصُوص لہجے میں کہنے لگی ـــــ "کچھ کام کاج تو ہے نہیں نارآئینی دیور کو لے کر اِسی سے سہاگ منایا جارہا ہے نا؟ ذرا اپنے لڑکے کو بھی تو دیکھ بیچارہ سُوکھ کر کانٹا ہوتا جارہا ہے۔ اِس کا بھی کچھ خیال ہے؟"

رآم نے اُس کی آواز سُن کر مُنہ اُٹھا کر دیکھا۔ دِگمبری کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھُوٹنے لگیں۔ وُہ کچھ کہنے ہی جارہا تھا کہ نارآئینی نے زور سے اُس کا مُنہ اپنی چھاتی سے دبالیا۔ ماں سے بولی ـــــ "آخر میرا لڑکا کس بات سے سُوکھ کر کانٹا ہوتا جارہا ہے ماں؟"

دِگمبری سے کوئی بات نہ بنی۔ لیکن صرف اتنا کہہ کر "میں کیا جانُوں؟" اُلٹے پاؤں جیسے آئی تھی ویسے ہی لوٹ گئی۔

رامؔ سے نہ رہا گیا۔ اُس نے زبردستی اپنا سَر اُٹھاتے ہُوئے کہا ——— "میں اِس چڑیل بڑھیا کا سر توڑ دُوں گا۔ گردن دبا کر مار ڈالوں گا۔"

نارائینی اُس کا مُنہ بند کرتے ہُوئے بولی ——— "چُپ رہ پاجی۔ وُہ ماں ہے نا؟"

جَب سے دِگمبری آئی تھی وُہ کسی نہ کسی بہانہ سے رامؔ سے اُلجھ پڑتی تھی۔ رامؔ تو نادان تھا ہی۔ لیکن دِگمبری اِتنی بڑی بُوڑھی ہو کر بھی اپنے گندے اور بُرے مزاج کی وجہ سے آئے دِن کوئی نہ کوئی بکھیڑا کھڑا کئے ہی رکھتی تھی۔

تین چار دِن کی بات ہے رامؔ کھانا کھا رہا تھا۔ اُس نے ایک دو نوالے ہی کھائے تھے کہ کھوں کھوں کر کے کھانسنے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ وُہ گلاس بھر پانی ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ اور کھڑا ہو کر پاؤں پٹکتے پٹکتے ہُوئے چِلّانے لگا ——— "اِس ڈائن بُڑھیا کے ہاتھ کا کھانا میں کبھی نہیں کھاؤں گا۔ ہرگز نہ کھاؤں گا۔ ارے بھابھی او بھابھی مارے مرچوں کے میرا مُنہ جل گیا ہے ———"

اُس کی آواز سُن کر نارائینی سندھیا کی پُوجا چھوڑ کر دوڑی آئی اور رامؔ سے پُوچھا ——— "کیا ہُوا رے؟"

رامؔ مارے غصّہ کے روتے ہُوئے بولا ——— "اِس کے ہاتھ کا کھانا مَیں کبھی نہ کھاؤں گا بھابھی۔ اِس چڑیل کو نِکال باہر کرو یہاں سے۔" اتنا کہہ کر رامؔ تیزی سے مکان سے باہر نِکل گیا۔

نارائینی کچھ دیر تو چُپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر ماں سے مخاطب ہُوئی ——— "ماں

کتنی بار کہا ہے کہ ساگ میں اِتنی مرچ مت ڈالا کرو۔ اِس گھر میں اِتنی مرچ کوئی نہیں کھاتا۔"

دِگمبری بھی غصّہ سے لال ہو کر بولی ——— "کہاں اِتنی مرچ ڈالی ہے۔ دو ہی تو مرچیں ڈالی ہیں۔ اِسی میں اتنا ہنگامہ ہو گیا۔ سارا گھر سر پر اُٹھا لیا۔"

نارائینی ——— "جب کوئی یہاں مرچ کھاتا ہی نہیں تو پھر دو مرچیں بھی ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟ تب ———"

دِگمبری ——— "چُپ رہ نارائینی چُپ رہ۔ تو اب مجھے ہی رسوئی بنانا سکھائے گی رسوئی ہی تو بناتے بناتے میرے بال پک گئے۔ اور اب اپنے ہی پیٹ کی لڑکی سے رسوئی بنانا سیکھنی ہوگی۔ لعنت ہے مجھ پر ———"

دِگمبری کی باتوں کا کچھ بھی جواب نہ دے کر نارائینی رسوئی گھر میں جا کر نئے سرے سے رسوئی کرنے کا بندوبست کرنے لگی۔

اِدھر دِگمبری دونوں پاؤں زمین پھیلا کر دونوں ہاتھوں سے سر اور سینہ پیٹتی ہوئی زور زور سے چلّا کر رونے لگی.... "ارے او بھیا۔ تم کہاں ہو؟ ایک بار مجھے بھی اپنے پاس بُلا لو نا؟ جس کے دِل میں جو آتا ہے مجھے گالیاں دیتا ہے۔ ارے بُڑھیا۔ میں چڑیل ہوں کل کا چھوکرا مجھے نِکال باہر کرنے کو کہتا ہے۔ میں کتنی نیچ ہوں کہ بیٹی اور داماد کا نمک کھا رہی ہوں۔ مرنے کے لئے میرے گلے کو رسّی بھی نہیں ملتی۔ اِس بے عزّتی سے تو اچھا ہے کہ مانگ کر ہی گزارہ کر لوں۔ سرو۔ او سرو۔ چل بیٹی اِس گھر سے۔ میں تو اب یہاں کا پانی بھی پینا حرام سمجھتی ہوں۔ آ بیٹی چل۔"

روتی ہوئی ماں کے پاس سرِ دُھنی آ کر کھڑی ہو گئی۔ دِگمبری اُس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کو تیار ہوئی کہ اُسی وقت نارائینی رسوئی گھر سے نکل کر آئی اور ماں کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

اُسے دیکھ دِگمبری روتے روتے بولی ——— "مجھے مت روک نارائینی جانے

دے۔ ہم لوگ بغیر کھائے پیئے درخت کے سایہ تلے رہ کر مر جائیں گے۔ لیکن تیرے گھر کا پانی بھی نہ چھوئیں گے۔ اور نہ تیرے گھر میں رہیں گے۔"

ناراینی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بڑی حلیمی سے کہا ——— "ماں آپ کس پر اتنا غصہ کر کے جا رہی ہیں؟ کیا ہم لوگوں سے کوئی خطا ہوئی ہے؟"

دِگمبری کا رونا پنجم سُر کو جا پہنچا۔ روتے ہوئے بولی ——— "میں نادان بچی نہیں ہوں ناراینی۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ اُسے تیرا ہی اِشارہ تو ملتا ہے۔ نہیں تو کیا اُس کی یہ ہمت ہو سکتی ہے کہ وہ میری توہین کرے۔ میں چڑیل ہوں۔ مجھے نکال باہر کر دو اچھی بات ہے میں تو جا رہی ہوں۔ ہم لوگ تو تمہارے گلے کا پھندا تھے نا؟ راستہ چھوڑ دے ناراینی جانے دے ہمیں ———"

ناراینی اپنی ماں کے دونوں پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی اور بولی ——— "ماں اب جو کچھ ہوا اُس کے لئے میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ رام کے بھیا کو آ جانے دو۔ اِس کے بعد جہاں تمہاری مرضی ہو چلی جانا۔ اِس وقت تو گھر میں چلو ماں۔ اتنا کہہ کر ناراینی اپنی ماں کے دونوں ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے کمرے میں لے آئی۔ اور اُنہیں چٹائی پر بٹھا کر سرہانے کھڑے ہو کر پنکھے سے ہوا دینے لگی۔

اِس وقت تو دِگمبری کے غصہ کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ لیکن دوپہر کو رسوئی گھر میں شیام لال کے کھانے کو آتے وقت اُس کا ناٹک پھر سے شروع ہو گیا۔ شیام لال کو پروسی تھالی پر بیٹھتے ہی دِگمبری نے کواڑ کے پیچھے چھُپ کر پھر رونا شروع کر دیا۔ اور خوب نمک مرچ لگا کر صبح کی باتیں بتانے لگی۔ پہلے تو اچانک رونے کی آواز سُن کر شیام لال ہکا بکا ہو کر تاکتے رہے۔ لیکن اُنہیں سمجھتے دیر نہ لگی کہ اِس ڈرامہ کا ہیرو رام کے سوائے اور کوئی اور نہیں۔ اب تک اُنھوں نے ایک دو نوالے ہی کھائے تھے لیکن سبھی باتیں معلوم ہو جانے پر وہ باقی تمام کھانا تھالی ہی میں چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

نارائینی کو سمجھنے دیر نہ لگی کہ یہ غصہ کس پر ہے۔ لیکن بزت کالی سے شیام لال کا اس طرح نہ کھا کر اُٹھ جانا برداشت نہ ہُوا۔ وُہی اس گھر میں کھری بات کہنے والی تھی جیسے جو کچھ کہنا ہوتا بغیر جھجک کے وُہ اُس کے مُنہ پر کہہ ڈالتی تھی۔ وُہ دِگمبری سے بول ہی تو اُٹھی ——— "بڑی ماں جی آپ نے جان بُوجھ کر بڑے بابُو کو کھانا بھی نہیں کھانے دیا۔ صُبح کے گئے بے چارے کام کاج سے تھکے ماندے آئے تھے آپ کو اُن پر کیا ذرا بھی ترس نہ آیا؟ تھوڑی دیر ٹھہر کر رو لیتیں۔ آپ کی آنکھوں کی ندی سُوکھی تو نہیں جا رہی تھی۔ کم سے کم بابُو کو کھانا تو کھا لینے دیتیں۔ دو منٹ ٹھہر جانے سے کچھ حرج نہ ہو جاتا۔

دِگمبری کا لا مُنہ کئے چُپ چاپ اپنی کرنی کا تماشہ دیکھتی رہی۔

دوپہر کو رام کہیں سے گھُومتا پھرتا گھر میں آیا۔ بھابھی کی تلاش میں وُہ اِس کمرہ سے اُس کمرہ میں اُن کے کمرہ میں آیا اور دیکھا کہ نارائینی گُو بند کو لئے سو رہی ہے اُسے آج میں کچھ کالا نظر آیا۔ اِس لئے بُہت آہستہ سے اُس نے نارائینی سے کہا۔ ——— "بھابھی بھُوک لگی ہے"۔

نارائینی نے کوئی جواب نہ دیا۔

اِس دفعہ ذرا زور سے رام نے کہا ——— "بھُوک لگی ہے کیا کھاؤں بھابھی"

اِس دفعہ نارائینی نے جواب دیا لیکن سوئے ہی سوئے ——— "میں کچھ نہیں جانتی تُو یہاں سے چلا جا"

رام ——— "معلوم ہوتا ہے تجھے بھُوک نہیں لگتی"۔

نارائینی نے مُنہ پھیر کر بڑے کرب سے کہا ——— "میرا سر مت کھا رام پیتا وہیں کہیں ہوگی اُس سے جا کر مانگ لے"۔

رام نے کچھ بھی کہنا ٹھیک نہ سمجھا اور چُپ چاپ باہر چلے جانے میں ہی خیریت

محسوس کی۔ پنیا اُسے رسوئی گھر کے دروازے پر ہی مل گئی۔ رام نے اُس سے کھانے کو مانگا۔ جیسے وُہ اُس کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ اُس نے فوراً ہی ایک کٹورے میں دُودھ۔ تھوڑا سا چبینا اور پانچ چھ ٹکڑے ناریل کی گری کے لاکر رام کے سامنے رکھ دیئے۔

رام نے تنک کر کہا ——— "کیا یہی کھانا ہے؟"

پنیا بولی ——— "چھوٹے بابو اگر خیریت چاہتے ہو تو کچھ گڑبڑ نہ کرو۔ کچھ معلوم بھی ہے کہ آج بڑے بابو بغیر کھائے ہی کچہری چلے گئے ہیں۔ ماں جی بھی بھوکی پیاسی گوبند کو لے کر سوئی پڑی ہیں۔ اگر یہ گڑبڑ سُن کر اُٹھ آئیں تو اِس کا نتیجہ بہت بُرا ہوگا۔"

رام کو پہلے ہی شک تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اب تو پنیا کے منہ سے سنکر معاملے کی گہرائی اور بھی واضح ہوگئی۔ اِس سے وُہ کچھ بھی نہ بولا۔ چُپ چاپ دُودھ کا کٹورا اُٹھا کر دُودھ پی کر چلا گیا اور چبینا اور گری کے ٹکڑے جیب میں ڈال تالاب کے درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ کھانے کو تو وُہ ایک ایک دانہ کر کے مُنہ میں ڈال رہا تھا۔ لیکن اُس کی بھوک اُسی وقت مر چکی تھی جب کہ اُسے یہ معلوم ہُوا کہ بھابھی بغیر کچھ کھائے پیئے ہی سوئی ہُوئی ہے اس لئے اُس سے کچھ بھی کھایا پیا نہیں جا رہا تھا۔ وُہ طرح طرح کی باتیں سوچنے لگا۔ اُس کے خیال میں عجیب قسم کے خیالات گردش کرنے لگے۔ اُس کے دِل میں خیال آیا کہ اگر وُہ سادھو سنیاسیوں کے مانند منتر جانتا ہوتا۔ تو اِسی وقت منتر کے زور سے یہاں سے بیٹھے ہی بھابھی کا پیٹ بھر دیتا۔ پھر اِس سے بھی کیا ہوگا؟ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ بھیا نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے تب پھر بھابھی بھلا کیسے کھا سکتی ہے۔ اور ایسی حالت میں زبردستی کرنا بھی بالکل بے سُود ہوگا۔ اب تو اُس سے ایک دانہ بھی نہیں کھایا جا رہا تھا۔ اُس نے اپنی جیب کا چبینا اور گری سب تالاب میں پھینک دیا۔ اور اپنی شوخ طبیعت کے ہاتھوں لاچار ہو کر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اُس کے دِل میں ایک ہی خیال بار بار اُٹھ کر اُسے بے چین

کہہ رہا تھا کہ آج بھابھی نے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ جتنی دفعہ وہ اِسے سوچتا اُتنا ہی زیادہ اُسے اپنے دِل میں درد اُٹھتا محسوس ہوتا۔

رات کو شیام لال نے اپنی بیوی تارا ایمنی سے کہا ——— "اب تو مجھ سے بالکل ہی برداشت نہیں ہوتا۔ اُسکے ساتھ اب اِس گھر میں اکٹھے رہنا ناممکن سا محسوس ہو رہا ہے۔"

تارا ایمنی نے حیران ہو کر پوچھا ——— "آپ کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟"

شیام لال ——— "ارے وُہی رام کی بات کر رہا ہوں۔ آج چار پانچ دِن سے تمھاری ماں جی مسلسل کہے جا رہی ہیں کہ رام اُن کی بے سبب ہر وقت توہین کرتا رہتا ہے۔ میں کل ہی گاؤں کے چودھریوں کو اکٹھا کر کے روپیہ پیسہ زمین جو کچھ بھی ہے سب برابر سے بانٹ کر اُس کا حصّہ اُسے دے کر الگ کر دُوں گا۔ اب تو مجھ سے یہ روز روز کی کِلکِل ذرا بھی برداشت نہیں ہوتی۔"

تارا ایمنی کچھ دیر غم اور حیرت سے مُنہ لٹکائے بیٹھی رہی۔ پھر بولی ——— "کیا رام کو الگ کر دو گے؟ وُہ نادان لڑکا ہے۔ تمھاری دولت جائیداد لے کر وُہ بھلا کیا کرے گا؟"

شیام لال نے طنزیہ کہا ——— "ہاں ہاں وُہ تو اُبھی بچّہ ہی ہے جائیداد لے کر وُہ کیا کرے گا۔ یہ میں کیا جانوں؟ وُہی جانے۔ مَیں کچھ نہیں جانتا۔ میں اُس کا حصّہ اُسے دے کر اُس سے نجات پاؤں گا۔"

تارا ایمنی ——— "وُہ تو کچھ نہیں جانتا۔ لیکن میں تو جانتی ہُوں نا؟ معلوم ہوتا ہے کہ ماں جی لگاتار چار پانچ دِن سے یہی باتیں کہے جا رہی ہیں۔ میں آپ سے زیادہ اپنی ماں کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔"

شیام لال نے کچھ جھجکتے ہُوئے کہا ——— "نہیں نہیں اُنھوں نے اِس بات پر کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ مَیں خود سبھی کچھ اپنی آنکھوں سے کیا نہیں دیکھتا؟ آخر تمہارا خیال کیا ہے؟"

"میں تو یہی کہوں گی کہ ہم لوگوں کے سوائے اُس کا اور ہے ہی کون؟ کون سی ماں بہن یا کوئی رشتہ دار ہیں جو اُسے پکا کر کھلا دیں گے! کیا آپ اُسے نہیں جانتے؟"

شیام لال نے کچھ پریشان سا ہو کر کہا ——— "میرا ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں؟"

کہنے کو اِتنی بڑی بات مُنہ سے نکال گئے۔ لیکن اندر ہی اندر پریشان بھی ہو رہے تھے۔ شیام لال کے مُنہ سے اِتنی بڑی بات سُن کر نارائینی سُن ہو کر رہ گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس کے ہونٹ ساتھ نہ دے رہے تھے فقط پھڑپھڑا کر ہی رہ گئے۔ کچھ دیر چُپ رہ کر اُس نے خود کو سنبھالا اور پھر رُندھے گلے سے بولی ——— "آپ تو جانتے ہی ہیں کہ تیرہ سال کی عمر سے جب لڑکیاں گڑیاں کھیلتی ہیں اُس وقت ماں اِس گرہستی کا بوجھ میرے کندھے پر ڈال سورگ سدھار گئیں۔ اُس وقت رام اڑھائی سال کا تھا۔ اُوپر سے ساس جی ضرور دیکھ رہی ہونگی اور میں کس خوش اسلوبی سے گرہستی چلا رہی ہُوں۔ اِتنی بڑی ذمّہ داری سنبھالتے میں چھبیس سال کی جوان عُمر میں ہی اُدھ بُوڑھی ہو چلی ہُوں۔ رام کو میں نے جنم تو اپنی کوکھ سے نہیں دیا ہے لیکن سگّے بیٹے ہی کے مانند میں نے اُس کی پرورش کی ہے۔ اُسے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے۔ گو بند میں اور اُس میں کیا فرق ہے؟ آج آپ اُسے گھر سے نکال کر الگ کر رہے ہیں۔ آپ بیٹے کو ماں سے الگ کیسے کریں گے؟ میں آپ سے کہے دیتی ہُوں کہ اگر آپ نے میری گرہستی میں کچھ بھی گڑبڑ کی تو میں جا کر ندی میں ڈوب مروں گی۔ تب ایک شادی اور کر لیجئے گا۔ رام کو علیحدہ کر دیجئے گا۔ جو آپ کی مرضی ہو کر بیٹھئے گا۔ نہ تو میں کچھ دیکھنے آؤں گی اور نہ ہی کچھ کہنے۔"

ایک سانس میں نارائینی اِتنا کہہ کر چُپ ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ شیام لال دِل ہی دِل میں اُس سے خوف کھاتے تھے۔ اِس لئے پھر اُلٹی

نے اور کوئی بات نہ چلائی اور اِس طرح رام کو الگ کرنے کی بات وہیں کی وہیں اُس
رات رہ گئی۔

دوسرے دِن رام کو نارائینی نے اپنی گود میں بٹھا کر پیار سے اُس کی پیٹھ پر
ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہا ——— "رام تو یہاں نہ رہ سکے گا۔ تو کہیں الگ جا کر رہ۔
الگ رہ سکے گا؟"

رام فوراً ہی ہنستے ہُوئے بولا ——— "کیوں نہ رہ سکوں گا بھابی۔ تم گوبند
بھولا اور مَیں الگ رہیں گے۔ کب چلنا ہوگا؟"

یہ سُن کر نارائینی کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ کہتی بھی کیا؟ لیکن رام نے بات بند نہ
ہونے دی۔ کہنے لگا ——— "بھابی بولو نا؟ کب چلنا ہوگا ہمیں؟"

اِس کے جواب میں نارائینی نے رام کو اپنی چھاتی سے بھینچ کر کہا ——— "کیا تُو
بھابی کو چھوڑ کر الگ نہیں رہ سکتا؟"

رام نے نفی میں سر ہلا دیا۔

نارائینی ——— "اور بھابی مر جائے تو ———؟"

رام ——— "جاؤ بھابی کیا کہتی ہو بھلا ———؟"

"ابھی تو بھابی کی بات تک نہیں سُنتا جب مر جاؤں گی ———"

رام نے فوراً نارائینی کی بات کاٹ کر کہا ——— "کب میں نے تمہاری بات نہیں
مانی ہے ———؟"

نارائینی ——— "ارے تو میری بات سُنتا ہی کب ہے؟ کتنے دِنوں سے کہتی
ہُوں کہ تُو میری ماں کی بے عزّتی نہ کیا کر۔ تُو سُنتا ہی نہیں ہے۔ اِس دفعہ تو میں ضرور کہیں
چلی جاؤں گی۔"

رام نے مچل کر کہا ——— "میں بھی ساتھ چلوں گا۔"

نارائینی ـــــ "تجھ کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ میں کب چلی گئی۔"

رام ـــــ "اور گوبند ـــــ؟"

نارائینی ـــــ "وہ تیرے پاس رہے گا۔ تو ہی لکھا پڑھا کر اسے بڑا کرے گا۔"

رام ـــــ "نہیں یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا۔"

اس بار نارائینی نے ہنس کر کہا ـــــ "تجھے ہی کرنا ہوگا رے۔"

رام کو جیسے اپنی بھابھی کی باتوں پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔ اس نے بھی ہنس کر کہا ـــــ "سب جھوٹ ہے بھابھی۔ میں جانتا ہوں کہ تم کہیں نہ جاؤ گی۔"

نارائینی ـــــ "نہیں رے میں سچ کہتی ہوں ضرور کہیں نہ کہیں چلی جاؤں گی۔"

اس دفعہ رام نے دکھی ہو کر کہا ـــــ "اگر تمھاری سب باتیں مانوں تو؟"

نارائینی ہنستے ہوئے بولی ـــــ "تب نہ جاؤں گی۔ اور نہ ہی گوبند کو لکھا پڑھا کر بڑا بنانا پڑے گا۔"

رام خوش ہوتے ہوئے چہکا ـــــ "اچھا تم دیکھنا بھابھی آج سے میں تمھاری سبھی باتیں مانوں گا۔"

آٹھ دن بڑے آرام سے گذر گئے۔

رام نے اپنی طرف سے کوئی بات نہ اٹھنے دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ زیادہ تر نارائینی سے دور ہی دور رہنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن دگمبری اپنی سخت طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچھ کہنے سے چوکتی نہ تھی۔ وہ جب بھی موقعہ دیکھتی رام پر کچھ نہ کچھ طنز کر دیتی۔

تیکھا طعنہ سُنا ڈالنے سے باز نہ آتی تھی۔ رام اِن باتوں سے بے نیاز سا ہو گیا۔ اگرچہ اُس دِن کی بھابھی کے کہیں چلے جانے کی بات پر اُسے اعتبار تو نہ تھا۔ لیکن بھی اُس کی سنجیدگی کے سبب اُس کے دِل پر ایک خوف ایک ہراس سا ضرور پھیل گیا تھا۔

لیکن شاید یہ چین اور رام کی چُپ قُدرت کو بُری محسُوس ہو رہی تھی۔ ایسا موقع آپڑا کہ رام اور دِگمبری میں ایک دفعہ جھڑپ ہو گئی۔ الزام ہمیشہ کے مانند رام ہی کے سر تھوپا گیا۔

آج دِگمبری اپنے پِتا کا شرادھ کرنے کی تیاری میں تھی۔ اُس کے مرحُوم والد کی رُوح اَب تک تو اپنے لڑکے کے مکان میں سوئی پڑی تھی۔ لیکن اَب دِگمبری کے نارنگیا کے یہاں آجانے سے بیٹی اور داماد کے گھر میں اُس کا آواگون شروع ہو گیا تھا مطلب یہ کہ دِگمبری کو یہ سب باتیں خواب میں ہی دِکھائی دے رہی تھیں۔ کچھ بھی ہو مرحُوم باپ کی بے چین رُوح کی شانتی کے لئے اُن کے شرادھ میں بارہ برہمنوں کو کھانے کی دعوت دی۔

صُبح کا وقت تھا رام باغیچے میں بیٹھا ماسٹر جی کے دیئے ہُوئے سوالات حل کرنے میں مشغُول تھا۔ اِسی دوران بھولا نے آکر چپکے سے خبر دی کہ "بھگا بالدی اُس کے کارتک اور گنیش کو پکڑنے کے لئے جال لے کر گھاٹ پر گیا ہے۔ جلدی چل دیکھیں"۔

یہ کارتک گنیش کا قصّہ یُوں ہے کہ۔

کافی دِنوں کی بات ہے دو موٹی موٹی بڑی بڑی روہُو ذات کی مچھلیاں گھاٹ کے پاس نہ جانے کہاں سے آکر برابر گھُومتی رہتی تھیں۔ رام برابر گھاٹ پر جاتا اور انہیں کچھ نہ کچھ کھلا آتا۔ اُس کا کہنا تھا کہ وُہ دونوں اُس کی پالتُو مچھلیاں ہیں اُس نے اُن دونوں کا نام کارتک گنیش رکھ دیا تھا۔ تمام محلّے کے لوگ اِس بات سے واقف تھے۔ کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ ہوگا جس نے رام کے مُنہ سے اُن دونوں کارتک گنیش کی تعریف نہ سُنی

ہو۔ اور جو اُس کی نسد پر اُسے دیکھنے نہ آیا ہو۔ علاوہ ازیں اُن مچھلیوں میں کیا خاصیتیں ہیں اور اُن میں کون کارنک اور کون گنیش ہے یہ صرف رام ہی جانتا تھا۔ اُس کا ساتھی بھولا بھی اُنہیں ٹھیک طرح سے نہ پہچانتا تھا۔ اور غلط بتا دینے پر رام اُس کا کان کھینچ دیتا تھا

نارائینی بھی اِن باتوں کو جانتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ رام کے کارنک۔ گنیش اُس کے شرادھ کے دِن کام آئینگے۔

بھولا کی خبر سُن کر رام ذرا بھی متاثر نہ ہوا اور وُہ خلاف توقع سلیٹ پر ہی جھکا سوال حل کرتا ہوا بولا ——— "ایک بار بھگا اُنہیں پکڑ کر مزا دیکھتا۔ جال پھاڑ کر وہ نِکل جائیں گے"۔

بھولا بولا ——— "نہیں بھائی وُہ ہم لوگوں والا جال نہیں ہے۔ بھگا مچھیروں سے اُن کا موٹا جال لایا ہے۔ وُہ کافی مضبوط جال ہے۔ کارنگ۔ گنیش اُسے پھاڑ کر نِکل نہیں سکتے"۔

یہ سُن کر رام سلیٹ رکھ کر بولا ——— "چل دیکھوں تو"۔

بھولا کو ساتھ لے کر رام گھاٹ کے کِنارے آیا۔ اور اُس نے دیکھا کہ سچ مچ اُس کے کارنک گنیش کو پکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بھگا گھاٹ کے کنارے لائی پانی میں پھینک کر جال پھیلائے مچھلیوں کو پھنسانے کی کوشش میں تھا۔

رام نے آتے ہی بھگا کو ایک دھکا دیا اور کہنے لگا ——— "او مردود تو لائی پانی میں پھینک کر میری مچھلیوں کو پکڑ رہا ہے"۔

بھگا نے روتے روتے جواب دیا ——— "بھیا جی بڑے بابو پکڑنے کا حکم دے گئے ہیں۔ دُوسری مچھلیاں آج مِلی نہیں"۔

رام نے اُس کی باتوں پر کچھ دھیان نہ دیا اور اُس کے ہاتھ سے زبردستی جال چھین کر پھینک دیا اور کہا ——— "جا بھاگ جا یہاں سے۔ پھر کبھی میرے کارنک گنیش کی طرف

نظر اُٹھا کر بھی دیکھا تو بغیر خبر لئے نہ چھوڑوں گا۔"

بھگا نے جال اُٹھا لیا اور چُپ چاپ چلا گیا۔

رام گھاٹ سے واپس آکر پہلے کے مانند پھر سلیٹ پنسل لے کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اِس بات پر وُہ خاموش ہی رہا۔ کیونکہ مجھ بھی سے وُہ وعدہ کر چُکا تھا کہ وُہ آئندہ کوئی کسی قسم کا جھگڑا نہ کرے گا۔

دِگمبری آج جلدی سویرے اپنی پُوجا ختم کرنے میں لگی ہُوئی تھی۔ آج اُس کے دِل کی مُراد بر آنے کو تھی نا۔ دِگمبری نے بھی رام کے کارتک گنیش کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ اور وُہ اُنہیں گھاٹ پر دیکھ بھی آئی تھی۔ اُن دونوں مچھلیوں پر اُسی وقت سے اُس کی آنکھ لگی ہُوئی تھی۔ اِتنی خوبصورت اور بڑی روہو مچھلیوں کے لذیذ سر کا خیال ہی کر لینے سے اُس بیوہ دِگمبری کے مُنہ میں بھر آیا تھا۔ علاوہ ازیں اُس کا لالچ اپنے تک محدود نہ تھا بلکہ وُہ تو خود اپنے ہاتھ سے بنا کر اِتنا لذیذ کھانا شرادھ کے موقع پر اُن مدعو کردہ براہمنوں کو کھلا کر ثواب حاصل کرنا چاہتی تھی۔

اِس ثواب کی اُمید کافی عرصہ سے اُس کے دِل میں تھی۔ کل شیام لال بابو سے مچھلی کے بارے میں بغیر کارتک گنیش کا ذکر کئے وعدہ کر چکی تھی۔ اِس لئے اُنہیں مچھلیوں کو پکڑنے کے لئے بھگا کو ٹھیک کر رکھا تھا۔ اُس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وُہ مچھیروں کا موٹا جال لے کر اُسے پکڑے۔ اِس کے عوض اُسے چار آنے اِنعام دینے کا بھی وعدہ کیا۔ آج صبح ہی وہ کارتک گنیش کو گھاٹ کے کنارے گھومتی ہُوئی دیکھ آئی تھی۔ اُس نے بھگا کو ایک دفعہ پھر سب باتیں دہرا دیں۔ اِس لئے وُہ بڑے آرام سے بیٹھی تھی۔ اِدھر کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ تھی کہ رام کے کارتک گنیش ہی کو پکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سکیمیں بنائی جا رہی ہیں۔

اِدھر دِگمبری اپنی حسرت کے پُوری ہو جانے کی اُمید میں بیٹھی تھی کہ بیتابی نے آکر تنہائی میں خلل ڈالا اور کہا کہ مچھلیاں تو ملی نہیں اور بھگا کو جو مچھلیاں پکڑنے گیا تھا چھوٹے بابو

نے مار پیٹ کر بھگا دیا ہے۔ اتنا سنتے ہی دِگمبری مارے غصّے کے پاگل ہو اُٹھی۔ اُسے بھلے بُرے کی تمیز بھی نہ رہی اور ہاتھ اُٹھا کر چلاّئی ــــــ "میرا کتنا بڑا دُشمن ہے یہ چھوکرا۔ جس دن یہ مَرے گا میرے مَن کو شانتی اُسی دِن ملے گی۔ ہے بھگوان تم انتریامی ہو جانتے ہی ہو کہ میں اُبھی تک برتی ہی ہُوں۔ ایک بُوند بھی جل نہیں ڈالا مُنہ میں اور اِسی طرح روز برابر تھنا کرتی ہُوں۔ اگر تم سچے ہو اور میری یہ باتیں سچّی ہیں تو اے بھگوان دُوسری رات گذرنے سے پہلے ہی یہ پاپی اِس دُنیا سے چل لبے۔

کچھ ہی دُور نارایَنی بیٹھی ترکاری کاٹ رہی تھی۔ دِگمبری کی یہ باتیں سنتے ہی تلملا اُٹھی اور برق رفتاری سے اپنی ماں کے پاس آئی۔ سُوکھے پتے کے مانند کانپتے ہُوئے فقط یہی کہہ پائی "ماں" اور ایک لفظ بھی اُس کے مُنہ سے نہ نکلا۔ نارایَنی کے مُنہ سے اتنی سنجیدگی اور دُکھ سے نکلا ہُوا لفظ "ماں" سُنکر دِگمبری کی چھاتی کا خُون ٹھنڈا ہو گیا۔ اور سکتہ طاری ہوگیا دیکھتے ہی دیکھتے نارایَنی کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی ندیاں بہہ نکلیں اور وُہ کچھ دیر اِسی طرح کھڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اپنے آنچل سے بہتے ہُوئے آنسوؤں کو پُونچھ کر وہاں آئی جہاں رام بیٹھا اپنا سوال حل کر رہا تھا۔

نارایَنی نے بڑے سخت لہجہ میں کہا ــــــ "رام تُو نے مار پیٹ کر بھگا کو کیوں بھگا دیا؟"

اچانک اِس حملہ سے گھبرا کر رام نے حیرت سے سَر اُٹھا کر دیکھا اور کچھ دیر بھابھی کے مُنہ کو دیکھتا ہی رہا۔ وُہ نارایَنی کے اِس اچانک سوال سے اِتنا چکرا گیا کہ اُس کے مُنہ سے کوئی بات تک نہ نکلی۔ اُسے کچھ سُوجھ نہ پڑا۔ فوراً ہی وُہ سامنے والے دروازے سے باہر نکل گیا۔

نارایَنی ابھی تک حقیقت سے انجان تھی۔ اُسے ذرا بھی خبر نہ تھی کہ یہ تمام ساری رام کے کارنامہ۔ گنیش پکڑلے کیلئے کیجا رہی ہے۔ ادھر نارایَنی کے اچانک ایسے سوال سے رام اتنا گھبرا گیا کہ اُس سے سب باتیں نہ کہہ سکا اور نارایَنی حقیقت سے بے خبر رہی۔ گھر میں واپس آکر اُس نے بھگا کو بُلوایا اور شرادھ کے لئے مچھلی پکڑ لانے کا حکم دیا۔

بس ایک دم بھر کی دیر تھی کہ بھگا بھاگ کر گھاٹ پر گیا اور وہاں پر گھومتے ہوئے کارتک گنیش کو جال میں پھنسا کر لے آیا۔ اور آنگن میں پٹک دیا۔

نارائنی رسوئی گھر کے دروازے پر کھڑی تھی۔ مچھلی دیکھتے ہی وہ چکرا گئی کچھ سوچ کر بھگا سے بولی ——— "اسے گھاٹ سے تو نہیں پکڑا ہے؟ کہیں یہ کارتک گنیش میں سے تو نہیں ہے؟"

بھگا نے اتنی بڑی مچھلی اتنی جلدی پکڑ لانے میں بڑی بہادری محسوس کی اور اسی گھمنڈ سے پھول کر کہنے لگا ——— "جی ہاں ماجی۔ یہ گھاٹ کی مچھلی روہو مچھلی ہے بڑی مشکل سے اسے پکڑ پایا ہوں۔"

نارائنی ——— "اور کیا تالاب میں مچھلی نہیں تھی جو تو اسے پکڑ لایا ہے؟"

بھگا کچھ بھی نہ سمجھ پایا۔ لیکن پھر بھی اس نے دگمبری کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہا ——— "بڑی ماں جی نے تو اسی مچھلی کو پکڑنے کے لئے کہا تھا۔"

نارائنی افسوس میں ڈوبی ہوئی کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اگر وہ جانتی تو کبھی بھی بھگا کو مچھلی پکڑنے کا حکم نہ دیتی۔ اسے اپنی غلطی پر بڑا افسوس ہوا۔ اور وہ اپنے کو مجرم خیال کرنے لگی۔ زرت کالی کو بھی اگرچہ رام کی شرارتوں کی وجہ سے اس کے خلاف شکایت رہتی تھی۔ لیکن دگمبری کی اس کرتوت پر اسے بھی بڑا افسوس ہوا۔ اپنی صاف گوئی کی عادت سے مجبور ہو کر وہ دگمبری کو مخاطب کر کے کہہ ہی اٹھی ——— "اچھا بڑی ماں جی گاؤں کا بچہ بچہ اس کارتک گنیش کی کہانی سے واقف ہے۔ کیا آپ کو اس کے بارے میں کچھ بھی خبر نہ تھی جو آپ نے اس مچھلی کو پکڑ لانے کا حکم بھگا بگری کو دیا۔ گاؤں میں تین چار تالاب ہیں کیا ان میں مچھلی نہیں تھی یا صرف دس کو برہمن کھائیں گے اس کے لیے اتنی بڑی آدھے من کی مچھلی کی کیا ضرورت تھی؟ اسے چھپا دینے ہی میں بھلائی ہے۔ معلوم نہیں وہ کہاں گیا ہے۔ کہیں ابھی نہ آ جائے۔"

دگمبری نے مجرم کے مانند منہ لٹکا کر کہا ——— "او بابا۔ اتنی بڑی بات کا تو مجھے

——— پتہ نہیں تھا۔ ایک مچھلی پکڑنے کی وجہ سے سب نے مل کر اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا اس کو چھپا کر رکھنے کی کہتی ہو۔ کیا برا ہمنوں کا بھوجن نہ ہوگا؟"

پنیا بولی ——— "بڑی ماں جی آپ کے برا ہمن کھائیں گے دو یا ڈھائی بجے کے قریب۔ چھوٹے بابو کو اسکول چلا جانے دو۔ نہیں تو گھر میں قیامت اٹھ کھڑی ہوگی۔"

"ارے بھولا کہاں ہے؟ ابھی تک یہیں کھڑا تھا۔ آخر گیا کہاں؟ معلوم ہوتا ہے وہ رام کو خبر کرنے گیا ہے۔ اب جو مرضی ہو کرو۔ کھڑے ہو کر اب سوچنے کا وقت نہیں"

بھگا نے چار آنے کے لالچ میں اتنی مچھلی پکڑ کر لا دی تھی۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی اس کے برعکس نظر آ رہا تھا۔ اس لئے چار آنہ وصول ہونے کی امید چھوڑ کر جال لے کر چلے جانے ہی میں اس نے غنیمت سمجھی۔

بھولا رام کا پکا ساتھی تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ضرورت کے وقت کب کس وقت اور کہاں رام کو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ رام کے کارتک گنیش میں سے ایک کے مارے جانے کی خبر اسی وقت دینے چلا گیا۔ باغیچہ کے جنوب کی جانب والے امرود کے درخت کے نیچے بیٹھے رام کے پاس پہنچ گیا۔ رام درخت کی ڈال پر بیٹھا نیچے پاؤں لٹکائے امرود کھا رہا تھا۔

ہانپتے ہانپتے بھولا نے رام سے کہا ——— "بھیا جی چلئے بھگا آپ کے کارتک کو مار لایا ہے۔ رام نے امرود کھانا بند کر دیا۔ اسے بھولا کی باتوں پر یقین نہ آ رہا تھا لیکن بھولا نے یقین دلاتے ہوئے کہا ——— "نہیں بھیا جی سچ کہتا ہوں۔ ماں جی نے ہی پکڑنے کا حکم دیا تھا۔ ابھی تک کارتک آنگن ہی میں پڑا ہے۔ چل کر خود دیکھ لو نا؟"

رام بھولا کی باتیں سن کر فوراً ڈال پر سے کود پڑا۔ اور بھاگا بھاگا آنگن میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ بھولا کی بات سچ نکلی۔ وہ اپنی مچھلی کو آنگن میں مردہ پڑا دیکھ کر زور سے چلا اٹھا۔ اور بڑے زور سے روتا ہوا بولا ——— "یہی تو میرے گنیش ہیں۔ او بھابھی

تُم ہی نے میرے گنیش کو حُکم دے کر پکڑوایا ہے۔ اِتنا کہہ کر وُہ کٹے بکرے کی مانند زمین پر گِر کر ہاتھ پٹک پٹک کر رونے لگا۔ ایک معمُولی سی مچھلی کیلئے بچّو کتنا گہرا زخم تھا۔ اس میں شاید دِگمبری کو کچھ شُبہ نہ رہا۔

مارے دُکھ کے رام نے دِن بھر کچھُ نہ کھایا۔ چُپ چاپ اپنے کمرے میں دِن بھر پڑا رہا۔ نارائنی نے رام کو کھانا کھا لینے کے لئے بہُت کہا۔ اپنے ہاتھ سے کھلانے کی کوشش کی لیکن وُہ نارائنی کا ہاتھ بار بار ہٹا دیتا۔ کِسی طرح بڑی مشکل سے وُہ رام کے مُنہ میں دو چار نوالے ڈالنے میں کامیاب ہو سکی۔ رام بغیر کھائے ویسے ہی اُٹھ گیا۔

دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو کر دِگمبری نے شیام لال سے کہا ــــ "تم ایک بار نارائنی سے کھا لینے کو کہو۔ نہیں تو کھانا نہیں کھائے گی۔ آج سارا دِن سے وُہ بھُوکی ہی ہے۔ شیام لال نے پُوچھا ــــ "لیکن یہ کیوں؟"

دِگمبری نے اپنے لہجہ کو دردمند بناتا ہوا بنا کر کہا ــــ "مجھ سے بہُت بڑی غلطی ہو گئی ہے بیٹا۔ لیکن یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تالاب سے ایک مچھلی براہمن بھوجن کے لئے پکڑوا لینے کی وجہ سے اتنا بڑا مہابھارت اُٹھ کھڑا ہو گا۔"

شیام لال دِگمبری کے مقصد کو ٹھیک طرح سے سمجھ نہ سکے۔ اس لئے اُنھوں نے پنیا کو بُلا کر پُوچھا ــــ "کیا بات ہے پنیا؟"

پنیا نے فوراً آ کر کہا ــــ "جو مچھلی پکڑی گئی ہے وُہ چھوٹے بابُو کے گنیش ہیں۔"

اتنا سُنتے ہی شیام لال کانپ گئے اُس نے پُوچھا ــــ "رام کے ندی والے کہ لک گنیش میں سے ایک تو نہیں ہے یہ؟"

پنیا بولی ــــ "ہاں۔"

اب کچھُ اور کہنے کی ضرورت نہیں سارا مُعاملہ وُہ سمجھ گئے کہ اُنھوں نے پھر پنیا سے پُوچھا ــــ "معلُوم ہوتا ہے اِسی لئے رام نے کھانا نہیں کھایا ہے۔"

پنیتا ــــــ "نجی۔"

شیام لال ــــــ "تب نارائنی سے کہنے سے کچھ بھی نہ ہو گا۔ جب رام نے نہیں کھایا ہے تب وہ کیسے کھا سکتی ہے۔"

دِگمبری پھر کہنے لگی ــــــ "بھیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اِتنی بات بڑھ جائے گی تو میں براہمن بھوجن کی بات ہی نہ کرتی۔ پھر نارائنی ہی نے تو مچھلی پکڑنے کی اجازت دی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خود حکم دے کر ایسا حال کرنے سے اُس کا کیا مطلب ہے۔ یہ تو وہی کہہ سکتی ہے؟ نہ ہو بھیا جی۔ ہم لوگوں کو کہیں اور بھیج دو۔ اب تو اِس جگہ رہنے کو ایک لمحہ میں دِل نہیں مانتا۔ میرے چلے جانے سے سب کو خوشی ہو گی اور پھر یہ روز روز کے جھگڑے بھی خود ختم ہو جائیں گے۔"

کچھ دیر چُپ رہ کر ترِیا چرتر کرتی ہوئی دِگمبری پھر سے رونے والا ڈرامہ کھیلنے لگی ــــــ "بھیا جی یہ سب میرا ہی قصور ہے۔ میرے ہی نصیب بُرے ہیں۔ اگر اِس طرح میری قسمت پھوٹی نہ ہوتی تو میرا بھائی ہی کیوں مرتا۔ اور مجھے اپنے پیٹ کی لڑکی کے گھر لات جھاڑو کھا کر کیوں اپنی زندگی گذارنا پڑتی؟ اے بھیا جی اب تو ہم بالکل ہی بے سہارا ہیں۔ ہمارا اِس جہان میں اپنا کہنے والا کوئی نہیں ہے۔ اب تم ہی کو ہمارا کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا ہی ہو گا۔"

دِگمبری کی یہ سب باتیں سُن کر شیام لال پریشان ہو اُٹھا اور شش و پنج میں پڑ گیا ہاں یا نہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

اپنے کمرہ کے دروازہ پر کھڑی نارائنی اپنی ماں کی سبھی باتیں سُن رہی تھی۔ اُس کو خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ اُس کی ماں اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے اِتنی بے شرمی سے اُس پر الزام لگائے گی۔ اپنے شوہر کے سامنے اپنی ماں کے اِس سلوک سے وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ زمین میں گڑ سی گئی۔

پیج مُچ اُس رات رام نے پھر دروازہ نہ کھولا۔ نارایُنی بے چاری بے بس ہو کر اپنا سا مُنہ لے کر اپنے کمرے میں لوٹ آئی اُداس اور غمگین ہو کر بستر پر پڑی رہی شیام لال اُس کمرہ میں بیٹھے سب سُن رہے تھے۔ نارایُنی کو مایُوس اندر آتے دیکھ کر کہنے لگے۔ "میں تو اِن آئے دِن کے جھگڑوں سے تنگ آ گیا ہُوں۔ اَب مجھ سے اِتنی پریشانی برداشت نہیں ہوتی۔ اگر تُم اِس کا کچھ حل نہیں کرتیں تو جہاں میری مرضی ہو گی چلا جاؤنگا پھر تُم لوگ مجھے قصُوروار نہ کہنا۔"

شیام لال کی باتیں سُنکر نارایُنی نے کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن غم اور غصّہ کی شدّت سے اُس کی آنکھوں میں آنسُو آ گئے۔

اِس واقعہ کو دو تین دِن گُذر گئے۔ لیکن پھر بھی رام کا غصّہ ٹھنڈا نہ ہُوا تھا۔ سارا گھر اُسے اپنا دشمن دِکھائی دینے لگا۔ یہاں تک کہ اُس نے بولنا تک بند کر دیا۔ کھانے پینے تک کے لئے وُہ کسی سے نہ کہتا۔ اُس کے اِس سلُوک سے نارایُنی اندر ہی اندر پریشان اور رنجیدہ سی رہنے لگی۔

شام کا وقت تھا۔ دِگمبری ندی میں نہانے گئی ہوئی تھی۔ وُہ نہا بھی رہی تھی اور دُنیا بھر کی کتھائیں اپنی پڑوسنوں سے کہتی بھی جا رہی تھی۔ وُہ رام کی بُرائی خوب کر رہی تھی۔ اور اِس بات میں نارایُنی کو خطاوار بتا کر اُسے بے وقوف لڑکی بنایا۔ اپنے متعلق بھی وُہ بہت لمبی چوڑی باتیں بنا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کِس طرح وُہ اپنے بھائی کی گرہستی کی پُوری پُوری حقدار تھی۔ اُس کا بھائی اُس سے بغیر پُوچھے ایک تنکا بھی اِدھر سے

اُدھر کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ اور اُس کی عمر کوئی زیادہ نہیں ہے اُس کے یہ بال غم اور فکر سے اِتنی جلدی پک گئے ہیں۔

اِسی طرح کی بے کار سی باتیں کرتی ہوئی وُہ پڑوسنوں کے ساتھ گھر کی طرف آ رہی تھی کہ راستہ میں اُسے رام کی ایک نئی شیطانی کی خبر لگی۔ بھلا رام کے خلاف کوئی بات سُن کر وُہ چُپ رہ سکتی تھی؟ بھاگی بھاگی جیسے ہَوا کے کندھوں پر سوار ہو کر وُہ گھر آ پہنچی اور آنگن میں پہلا قدم رکھتے ہی چلّا کر بولی ــــــ "اے نارائینی کچھ اپنے لاڈلے دیور کی بھی کرتوت سُنی ہے تُو نے؟"

اِدھر شام ہو چلی تھی۔ اور جج کا گیا رام ابھی تک سکول سے لوٹ کر نہیں آیا تھا جیسے جیسے آفتاب کا نُور مدھم ہوتا جا رہا تھا ویسے ویسے ہی نارائینی کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اِسی دوران اپنی ماں کے مُنہ سے یہ الفاظ سُن کر اُس کا رہا سہا حوصلہ بھی جاتا رہا۔ بڑی سنجیدگی سے بولی ــــــ "کیا ہو گیا ہے ماں؟ رام نے کیا کر ڈالا ہے؟"

ڈگمبری بولی ــــــ "تھانے گئے ہیں وُہ لوگ۔ اور پھر جائیں گے بھی کیوں نہیں اِتنا نالائق لڑکا ہے کہ کیا کہوں؟ میں نے سات جنم بھی اِتنا شرارتی لڑکا نہیں دیکھا ہے۔"

رام کی بُرائی سُن کر جیسے اُس کے مُنہ اور آنکھوں سے مسرت ٹپکی پڑتی تھی اور جیسے وُہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔

نارائینی کو نہ تو ماں کی باتیں اچھی لگیں اور نہ ہی اُس نے کچھ جواب ہی دیا۔ اُس نے پنیا کو بُلا کر کہا ــــــ "او پنیا۔ دیکھ رام ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ جا کر بھولا کو بھیج دے۔"

سب باتیں سُننے کے لئے پنیا ڈگمبری کے پاس کھڑی تھی اور اُسے اسی طرح کھڑی دیکھ کر نارائینی پھر بولی ــــــ "تُو ابھی تک یہیں کھڑی ہے۔ میں نے رام کا پتہ لگانے کو کہا ہے نا؟"۔ پنیا نہ چاہتے ہوئے بھی چلی گئی۔

دِگمبری نے ایک بڑی لمبی اور گہری سانس لی۔ جیسے ایک سانس ہی میں وُہ سب کُچھ کہہ جائے گی۔ کہنے لگی ـــــــ "کیا ہُوا ہے تُو جانتی ہے نارائینی؟"

نارائینی نے اُس کی باتوں پر کُچھ دھیان نہ دے بڑی لاپرواہی سے قطع کلام کرتے ہُوئے ٹوکا۔ "ماں پہلے تم بھیگا کپڑا تو اُتار دو بعد میں سب باتیں کہہ دو گی تو کُچھ حرج نہ ہوگا" اِتنا کہہ کر وُہ وہاں سے ہٹ گئی۔

لیکن دِگمبری حیران ہو کر مُنہ بچکاتے ہُوئے بڑبڑائی ـــــــ "ارے واہ! اِس کل کی لڑکی کا غصہ تو دیکھو" اُس وقت رام کی اِتنی بڑی بات نہ کہہ سکنے کی وجہ سے اُسکا پیٹ پھُولنے لگا۔

بات یہ تھی کہ رام کے سکُول میں اُسی گاؤں کے زمیندار کا لڑکا بھی پڑھتا تھا۔ آج دوپہر کو کھانے کی چھُٹی کے وقت اُس میں اور رام میں ایک بیکار سی بات پر بحث ہونے لگی۔ چُونکہ اُس بات کا کوئی سر اور پیر نہ تھا اِس لئے اُس کا کُچھ فیصلہ نہ ہو سکا اور نتیجہ یہ ہُوا کہ دونوں میں مار پیٹ ہونے لگی۔

زمیندار کے لڑکے نے کہا تھا ـــــــ "شاستروں میں لکھا ہے کہ شمشان کالی کی طاقت رکشا کالی سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ شمشان کالی کی جیبھ زبان بہت لمبی ہے۔

رام نے اُس کے خلاف دلیل دیتے ہُوئے کہا ـــــــ نہیں نہیں کبھی نہیں۔ یہ سراسر غلط ہے شمشان کالی کی زبان ضرور ہے۔ لیکن نہ تو اِتنی بڑی ہے اور نہ ہی اِتنی چوڑی۔

کُچھ ہی دِن پہلے گاؤں میں چوڑہ چندہ کر کے رکشا کالی کی پُوجا کی گئی تھی۔ اِسی سلسلہ میں ماں کالی کی ایک مُورتی بھی ستھاپن کی گئی تھی۔ رام کو اُسی کا اس وقت خیال آیا۔

لیکن زمیندار کے لڑکے نے رام کی باتوں سے متفق نہ ہوتے ہُوئے کہا ـــــــ "نہیں رکشا کالی کی زبان اِتنی بڑی ہے"۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر زبان کی لمبائی چوڑائی بتا دی۔

رام نے غُصہ میں دونوں ہاتھ پھیلا کر زبان کی لمبائی چوڑائی بتاتے ہُوئے کہا ـــــــ "اِتنی ہی بڑی صِرف نہیں۔ دیکھ اِتنی بڑی۔ اِتنی چھوٹی زبان ہونے سے کیا کبھی وُہ تمام زمین

کی رکھشا کر سکتی ہے۔ تمام دُنیا اُن کی حفاظت کرنے کی وجہ سے تو اُن کا نام رکھشا کالی پڑا ہے۔"

اِس کے بعد دونوں میں کچھ گرما گرمی ہوئی۔ انجام کار آپس میں گھونسے بازی شروع ہو گئی۔ زمیندار کا لڑکا تھا کمزور۔ ناک سے ایک بُوند خُون زمین پر آ گرا۔

بس اتنی ذرا سی بات کا بتنگڑ بن گیا۔ آج تک اِس چھوٹے سے سکول میں کبھی اِتنی بڑی بات ——— زمیندار کے لڑکے کا پٹنا کبھی نہ ہوئی تھی۔ اِس لئے اِس ڈرامے نے ایک بہت بڑا اہمیت صُورت اختیار کر لی۔ علاوہ ازیں مار کھانے والا تھا زمیندار کا لڑکا ہی۔ اور سکول بھی تھا زمیندار کا ہی۔ اِس لئے سکول کے ہیڈ ماسٹر اُس لڑکے کو لے کر زمیندار کی کچہری میں جا حاضر ہُوئے۔ اور زمیندار سے سبھی باتیں سلسلہ وار کہہ دیں۔ اِدھر رام اِتنی سی بات کا بتنگڑ بنتے اور نازک صُورت اختیار کرتے دیکھ کر فوراً ہی وہاں سے ہوا ہو گیا۔

بھولا چچیتا کے کہنے پر اُسے کھوجنے نکلا تھا اُس کو کہیں نہ پا کر گھر لوٹ آیا۔ اور خبر دی کہ چھوٹے بابُو کا کہیں پتہ نہیں۔"

کافی دیر بعد شیام لال مُنہ لٹکائے ہُوئے گھر میں آئے اور آنگن ہی میں کھڑے ہو کر بولے ——— "سُنتی ہو جی؟ معلُوم ہوتا ہے رام کی وجہ سے اب مجھے اِس گاؤں سے نکل جانا ہو گا۔ نوکری کر کے چار پیسے لے کر گھر آتا تھا۔ اب اُس کا بھی سہارا گیا سمجھو۔"

شیام لال کی آواز سُن کر تارا دیبی باہر آئی اور سر کا کپڑا ذرا ماتھے پر کھینچ کر بولی ——— "کیا وہ لوگ تھانہ گئے تھے؟"

شیام لال نے سر ہلا کر کہا ——— "نہیں مالک تو دوسرے بھگوان ہیں۔ دیوتا ہیں۔ معاف کر دیا۔ لیکن اور بھی تو گاؤں کے لوگ ہیں۔ سب اُن کے مانند تو رحمدل نہیں ہیں۔ روز روز اگر وہ اِسی طرح ایک نیا فساد کھڑا کرتا رہا تو ہماری کب تک عزّت بنی رہے گی۔ کسی نہ کسی دِن تو ناک کٹ کر ہی رہے گی۔ اب تمہیں بتاؤ ایسی حالت میں کب تک گاؤں میں رہ پاؤں گا۔ رام کہاں ہے؟"

نارائنی نے بتایا ——— "وہ گھر ابھی تک نہیں لوٹا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ڈر کے مارے کہیں چھپا بیٹھا ہے"

شیام لال نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ——— "بھاگنے اور نہ بھاگنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب ہمیں اُس سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ میری سوتیلی ماں کا لڑکا ہے۔ لوگ کسی بات کو لیکر ہماری ہیکری نہ کریں۔ اِس لئے میں اب تک اُس کی شرارتیں بیہودگیاں برداشت کرتا رہا ہوں لیکن اب میں اور برداشت کرنے میں لاچار ہوں۔ کم سے کم اپنی عزّت اور جان تو بچانا ہی ہوگی"

رسوئی گھر کے دروازہ پر بیٹھی دِگمبری شیام لال کی سبھی باتیں سُن رہی تھی وہیں سے کہہ اُٹھی ——— "بھیّا یہ باتیں تو ٹھیک ہیں۔ لیکن اپنے لڑکے کی طرف تو دیکھنا چاہیئے"۔

شیام لال ذرا جوش سے کہنے لگے ——— "ہاں ماں جی ضرور دیکھنا چاہیئے۔ میں کل ہی گاؤں کے پنچوں کو اِکھٹا کر کے اُن کے سامنے زمین اور جائیداد وغیرہ سب دے کر الگ کر دوں گا" پھر اُنھوں نے نارائنی کی طرف دیکھ کر کہا ——— "اور تم بھی سُن لو اِس بات کو کہ اب اُسے ٹیک ٹیک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو وہ اچھا سمجھے کرے۔ اچھا ہی سمجھ کر تو اُس نے مالک کے لڑکے پر ہاتھ اُٹھایا تھا"

اِن سب باتوں کو سُن کر دِگمبری خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ وہ پھر بولی ——— "نارائنی کس لئے اُس پر حکم چلانے جاتی ہے یہ دیکھ کر تو میرا دِل کانپ کانپ جاتا ہے۔ وہ اُجڈ اور گنوار لڑکا ہے۔ جب میری ہی بے عزّتی کرنے سے نہیں چوکتا تو نارائنی کس کھیت کی مولی ہے۔ وہ مردود نارائنی کو تنکے کے برابر بھی نہیں گنتا۔ کسی دِن اُن کی بھی بے عزّتی نہ کر دے مجھے بھی ڈر ہے۔ پھر یہ اُس کے لئے ہے ہی کون سی بڑی بات؟ میں تو کہتی ہوں اپنی عزّت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ رام کے چکر میں اب پڑنے کی ضرورت نہیں"۔

شیام لال کو اپنی ساس کی یہ باتیں سُنکر شاید بڑی شرم محسوس ہوئی۔ اِس لئے اُنھوں نے پھر اُن باتوں کا ذکر نہ کیا اور اِتنا ہی کہہ کر چُپ ہو گئے "جواب میں کہے دیتا ہوں کہ اب اُسے کچھ

کہنے کی ضرورت نہیں۔"

نارائینی پتھر کا بت بنی کھڑی رہی۔ اور سب کچھ خاموشی سے سنتی ہی رہی۔ شوہر اور ماں کا ایک ایک لفظ اُسے جگر میں تیر کی مانند پیوست ہو رہا تھا۔ لیکن اُس نے ایک بات کا بھی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ سر جھکا کر اپنے کام کو چلی گئی۔

شب کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی تھی۔

قریب ایک گھنٹہ بعد بنیا نے آ کر نارائینی سے کہا ——— "ماں جی چھوٹے بابو جی آئے ہیں اور اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھے ہیں۔"

نارائینی بغیر کسی طرح کا کوئی لفظ کہتے ہوئے وہ چپ چاپ اُٹھ کر رام کے کمرہ میں آئی۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ رام تخت پر بیٹھا گھٹنوں میں مُنہ چھپائے جانے کیا سوچ رہا تھا کہ دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر چونک اُٹھا۔ سر اُٹھا کر دیکھا کہ اُس کی بھابھی دروازہ بند کر کے اُسی کونے میں رکھی پتلی چھڑی ہاتھ میں لئے کھڑی ہے۔ بھابھی کے اس رُوپ کو دیکھ کر وہ چکرا گیا۔ فوراً کود کر ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔

نارائینی چلّا کر بولی ——— "چل اِدھر آ۔"

رام نے ہاتھ جوڑ کر کہا ——— "اِس دفعہ چھوڑ دو بھابھی اب بدمعاشی نہیں کروں گا۔"

نارائینی نے خود کو سخت بناتے ہوئے کہا ——— "اِدھر چلا آ سیدھی طرح۔ نہیں تو یہ چھڑی تیری پیٹھ کا چمڑا ہی اُدھیڑ کر رکھ دے گی۔"

رام اُسی کونے میں کھڑا ہاتھ جوڑ کر التجا کرتے ہوئے بولا ——— "اب کبھی بھی نہیں کروں گا بھابھی۔ تم اِس بار صرف اِس بار معاف کر دو۔ میں سچ کہتا ہوں بھابھی۔ میں کان پکڑتا ہوں۔ اب کبھی ایسا نہ کروں گا۔"

اُسے قریب آتے نہ دیکھ کر خود تخت پر چڑھ گئی اور پورے زور سے ایک چھڑی اُسے جما دی۔ اِس کے بعد تو پھر بوچھاڑ ہونے لگی۔ پہلے تو رام نے دروازہ کھول کر بھاگ جانے

کی کوشش کی۔ لیکن نارائینی کی چھڑی کچھ اس تیزی سے اُس پر پڑ رہی تھی کہ اُس کے لیے بھاگ جانا بڑا مشکل ہو گیا۔ آخر رام نارائینی کے پاؤں پر گِر کر زور زور سے رونے لگا۔"
رونے کی آواز سُنکر بِنیا نے پیچھے سے کھڑکی میں آکر جو یہ منظر دیکھا تو مارے دُکھ کے رو پڑی اور کہنے لگی ... ——"ماں جی اب اُسے چھوڑ دو۔ یہ میری ہی غلطی ہے جو میں نے ....
لیکن ڈگمبری جو کھڑکی پر کھڑی تھی۔ جسکی چھاتی رام کی یہ حالت دیکھ کر خوشی سے پھولی جا رہی تھی۔ بِنیا کو ڈانٹ کر بولی ——" تو کیوں ہر معاملہ میں ٹانگ اَڑاتی ہے۔ نوکرانی ہے، نوکرانی کی طرح رہ"

اِسی دوران شیام لال دروازہ پیٹتے ہوئے بولے ——"یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ساری رات مار پیٹ ہوتی رہے گی؟"

شیام لال کی آواز سُن کر نارائینی نے چھڑی پھینک دی اور دروازہ کھول کر چُپ چاپ اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ ڈگمبری کا وہاں کھڑے رہنا اُسے بہت بُرا لگا۔ ڈگمبری اُس کے قریب کچھ کہنے آئی۔ لیکن نارائینی بڑی جلدی دِکھاتے ہوئے بغیر کسی کے پاس رُکے چلی گئی۔

رام کھانا کھانے بیٹھا تھا۔
ڈگمبری بھی اُس سے تھوڑی دُور بیٹھی تھی۔ رام کے ساتھ بڑی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بولی ——"اِتنے بڑے لڑکے کو مارنا پیٹنا کوئی اچھی بات ہے؟ اس کے بڑے بھائی نے تو آجتک اُس کے جسم پر ہاتھ بھی نہیں لگایا! کل رات کی مار پیٹ بڑی بیجا ہوئی تھی۔
بِنیا کو ڈگمبری کی یہ چکنی چُپڑی باتیں ذرا بھی پسند نہ آئیں۔ کہنے لگی ——"بڑی ماں جی

"آپ بھی تو کسی سے کم نہیں ہیں اور پھر سب آپ ہی کی تو لگائی بجھائی ہے۔ کیا جھوٹ سچ نہیں لگایا ہے آپ نے؟ آپ ہی نے پٹوایا تھا چھوٹے بابو کو۔ آپ ہی فساد کی جڑ ہیں"۔

کل لکا پٹنا تو رام کو بھی اچھا نہ لگا تھا۔ لیکن مارنے والی اُسکی بھابھی تھی نا اسی لئے وُہ چپ رہا ہے نہیں تو نہ جانے کیا ہو جاتا لیکن بھیا کے منہ سے۔ فساد کی جڑ دِگمبری ہے۔ سُن کر وُہ آپے سے باہر ہو گیا آنکھیں لال کر کے دِگمبری کی طرف گھورتے ہوئے بولا ——— "یہ ڈائن بڑھیا ہمارا سب کچھ کھانے آئی ہے"

یہ سُنکر دِگمبری نے نارائنی کو پکارا ——— "نارائنی او نارائنی اپنے دیور کی بات سُنتی جا"۔

نارائنی اسوقت گھاٹ پر نہانے جا رہی تھی، ماں کی آواز سُنکر بولی ——— "ماں اب میں کچھ نہیں سُن سکتی۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا۔ سچ کہتی ہوں اب مجھے مر کر ہی چین ملے گا۔ پھر رام کی طرف دیکھ کر بولی ——— "کیوں رے بندر۔ ابھی تو تیری پیٹھ کا درد بھی نہیں مٹا ہو گا ابھی سے ہی ساری مار بھول گیا اور لگا پھر شرارتیں کرنے ———" رام نے کوئی جواب نہ دیا چپ چاپ سر جھکا کر کھانا کھاتا رہا۔ نارائنی نے بھی کچھ اور نہ کہا۔ اپنی دھوتی کندھے پر رکھ ندی کو چل دی۔

صحن کے ایک کونے میں ایک امرود کا درخت تھا جو آنگن سے صاف دکھائی دیتا تھا بھات کھا کر رام اُس امرود کے درخت پر چڑھ گیا اور کچے پکے کی تمیز امرود کھانے لگا کسی کو آدھا کسی کو صرف دانتوں ہی سے کاٹ کر وہ صحن میں پھینکنے لگا یہاں تک کہ ایک دم کچے امرود بھی وُہ نہیں چھوڑ رہا تھا۔ رسوئی گھر کے دروازہ پر بیٹھی دِگمبری یہ سب کچھ دِل ہی دِل میں کڑھ رہی تھی۔ نارائنی ابھی تک ندی سے لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ جب دگمبری اپنے تئیں روک نہ سکی۔ اور کہا ——— "بیٹا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پکے امرود منہ لگانے کو بھی نہیں ——— یہ کچے امرود توڑ کر کھانا کیا اچھی بات ہے ———؟"

رام اور دِگمبری میں جیسے بلی کتے کی سی دشمنی تھی روز بروز سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ رام کو دگمبری کی باتیں تیر کی مانند چبھتی سی محسوس ہوتی تھیں اسوقت دِگمبری کا بولنا اُسے بچھو کا سا ڈنک مارنے لگا اس نے درخت پر سے ہی کہا ——— "ٹھیک کر رہا ہوں بڑھیا ———" دِگمبری سب کچھ سُن سکتی تھی۔ لیکن بڑھیا کا خطاب اُسے قطعی پسند نہ تھا۔ پھر رام کے منہ سے سُنکر تو وہ اور بھی بھڑک اُٹھی۔ بڑے ہی سخت لہجے میں بولی ——— "تو مجھے بڑھیا کہتا ہے؟ اچھا اسے نہا کر

آجائے دے۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے تھوڑے ہی مانتے ہیں۔ دیکھو تو کتنا بے حیا لڑکا ہے۔ اُس دن کی مار سے پیٹھ کی چمڑی اُدھڑ گئی پھر بھی ہوش نہیں آیا اسے۔ بے شرم کہیں کا ــــــــــ"

اُسکی باتوں کا رام نے امرود کے درخت پر سے ہی جواب دیا ــــــ "چڑیل بڑھیا کہیں کی"

دگمبری ــــــ "چڑیل بڑھیا، چھوٹا منہ بڑی بات کہتا ہے پاجی حرام زادہ کہیں کا۔ اُتر نیچے ابھی بتاتی ہوں تجھے" ــــــ رام نے اُوپر سے ہی جواب دیا ــــــ "کیوں اُتروں؟ تیرے باپ کا درخت ہے؟"

باپ کا نام سنکر تو دگمبری کے تن بدن میں آگ لگ گئی سُنتے ہی زور سے چلّائی ــــــ "اب میرے باپ تک پہنچنے لگا۔ سُنتی ہے بیٹی ــــــ"۔ اُسی وقت نارائینی گھاٹ سے نہا کر لوٹ آئی۔ درخت پر نظر پڑتے ہی بولی ــــــ "رام کھانا کھا کر سکول کیوں نہیں گیا۔ درخت پر کیوں چڑھا ہوا ہے ــــــ"

رام کو نارائینی کے اتنی جلدی لوٹ آنیکی ذرا بھی اُمید نہ تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ نارائینی جب راستے میں ہوگی تو اُسے دیکھ کر درخت سے اُتر کر بھاگ جائیگا۔ لیکن دگمبری کے ساتھ جھگڑے میں [illegible] راستہ پر نظر نہ رکھ سکا۔ [illegible] نارائینی صحن میں آکر ایکدم کھڑی ہو گئی۔ نارائینی کو دیکھتے ہی وہ گھبرا [illegible] ڈرتے ڈرتے بولا ــــــ "[illegible] دکھا رہا ہوں ــــــ"

نارائینی ــــــ "یہ تو دیکھ رہی ہوں لیکن تو سکول کیوں نہیں گیا ــــــ"

جب رام کو کوئی بہانہ نہ سوجھ پڑا تو جھٹ سے بول پڑا ــــــ "میرے پیٹ میں درد ہے بھابھی!"

نارائینی ــــــ "اِسی لئے کچے امرود کھائے جا رہے ہیں ــــــ؟"

اِدھر دگمبری اپنی لڑکی نارائینی کی آواز سُن کر صحن میں دوڑی آئی اور رام کی شکایت کرتے ہوئے [illegible] لگی ــــــ "سُنتی ہو نارائینی یہ حرامزادہ میرے باپ تک پہنچنے لگا ہے۔ کچے امرود [illegible] آنگن میں پھینک رہا تھا۔ [illegible] کر کے درخت سے اترنے کو کہا تو کہنے لگا ــــــ "کیوں اُتروں تیرے باپ کا درخت ہے کیا؟ ــــــ"

نارائینی نے غصہ سے آنکھیں سُرخ کر کے رام سے پوچھا ــــــ "کیوں رے تو نے ایسا کہا ہے کیا باپ کا نام لیا ہے؟"

رام ــــــ "نہیں بھابھی! میں نے کچھ بھی نہیں کہا ہے ــــــ"

دگمبری بولی ــــــ "حرامزادہ جھوٹا کہیں کا۔ کیا تو نے باپ کا نام نہیں لیا۔ بیٹیا نے بھی سُنا ہے"

[illegible] عجیب ڈھنگ سے مُنہ بنا کر ہنستے ہوئے بولی ــــــ بے حیا کہیں کا۔ اُس دن کی مار بھول گیا۔

جب پیٹھ پر چھپڑی سٹاسٹ اور پٹاپٹ پڑنے لگی تھی تو کیسے منہ سے نکل رہا تھا۔ میں ایسا نہ کرونگا "پاؤں پڑتا ہوں بھابھی، مر جاؤنگا بھابھی" اسوقت تو سوائے اسکے اور زبان سے کچھ نکلتا ہی نہ تھا۔ اسوقت کیا پٹاپٹ زبان لڑا رہا ہے، بے شرم کہیں کا ـــــ"

اب رام سے برداشت نہ ہو سکا۔ ایک تو ویسے ہی چوبیس گھنٹے اسکے دل میں دگمبری کے خلاف آگ جلتی رہتی تھی اور اُس پر اس طرح کی تیر کے مانند چبھنے والی باتوں نے اور بھی اُوپر تیل کا کام کیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا کچا امرود تھا۔ اُس نے وہ امرود بغیر ادھر اُدھر دیکھے دگمبری کی طرف چلا دیا۔ لیکن خوش قسمتی سے یا بد قسمتی سے نشانہ چوک گیا اور وہ امرود دگمبری کو لگنے کی بجائے نارائینی جو ابھی تک وہیں کھڑی تھی کی دائیں آنکھ کے اوپر آکر بڑے زور سے لگا۔ چوٹ شدید تھی۔ نارائینی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ وہیں بیٹھ گئی۔ بھابھی کا یہ حال دیکھ کر دوڑی آئی اور نارائینی کو سہارا دیکر اُس کے کمرہ میں لے آئی ـــــ رام کو اسکی ذرا بھی اُمید نہ تھی۔ غصہ میں آکر اس نے بغیر سوچے سمجھے امرود چلا دیا تھا لیکن اسکا اتنا بڑا نتیجہ دیکھ کر اُسکی دل دھک سے رہ گیا محسوس کرنے لگا۔ لیکن اسے اسوقت کچھ نہ سوجھا اور وہ وہاں سے دوڑ کر باہر کی طرف بھاگ گیا۔

دوپہر کے وقت جب شیام لال کھانا کھانے آئے تو اُنہیں اس واقعہ کی خبر ملی۔ اُنہوں نے دیکھا کہ نارائینی تکلیف سے پڑی کراہ رہی ہے۔ اُسکی دائیں آنکھ کی پتلی کے سوجھ جانے سے بند ہوگئی ہے۔ چوٹ لگی ہوئی جگہ کالی پڑ گئی تھی اور اُس جگہ کو ننیا سینک رہی تھی۔ شیام لال یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ شیام لال کو دیکھ کر دگمبری آج دروازہ کی اوٹ میں کھڑی نہ ہوئی بلکہ سامنے آکر روتے ہوئے بولی ـــــ "بھیا جی رام نے نارائینی کو مار ڈالا ہے" ـــــ اُنہوں نے دگمبری کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور نارائینی کے پاس جاکر اُسکی چوٹ کو دیکھا۔ چوٹ نہایت تکلیف دہ معلوم ہوئی وہ بیحد غمگین ہوکر نارائینی سے بولا ـــــ "تمہیں میری قسم ہے تم آج سے اُس مردود کے ساتھ کسی قسم کا بھی تعلق نہ رکھو اگر تم آج سے اُس سے بات کرو اور اُسکو کھانے کو دو تو تمہیں میرے سر کی قسم ... نارائینی یہ بات سنکر برداشت نہ کر سکی اور قطع کلام کرتے ہوئے کہنے لگی ـــــ "چپ رہیئے، چپ رہیئے ایسی بات زبان پر نہ لائیے" شیام لال نے چلا کر کہا ـــــ "میں کچھ نہیں جانتا اگر تم میری اتنی بڑی قسم نہ مانو تو میرا مرا منہ

مُنہ دیکھو۔۔۔" اِتنا کہہ کر شام لال خُود ہی ڈاکٹر کو بُلانے چلے گئے۔

رام سارا دِن ندی کے کنارے کنارے گھومتا رہا۔۔۔ بھابھی کو چوٹ کافی لگی ہوگی۔ اور پھر اُسی کے ہاتھ سے۔ بڑی بے چینی تھی اُسکے دِل میں۔ کبھی وُہ خیال کرتا۔۔۔ جس ہاتھ نے اَمرود چلا کر بھابھی کو مارا ہے اُسے کیوں نہ کاٹ ڈالے۔ اسی طرح بڑے عجیب غریب خیالات اُسکے دماغ میں گھومنے لگے۔ آوارگی میں تمام دِن کٹ گیا اِسی اُدھیڑ بُن میں نہ تو اُسے بھوک ہی لگی اور نہ اُس نے خُود ہی کچھ کھانا چاہا۔ آہستہ آہستہ آفتاب بھی غروب ہوگیا اور شفق کی لالی نے ایک عجیب سا سماں بنا دیا۔ کافی اندھیرا ہو جانے پر وُہ گھر میں گھُسا۔ نہ معلُوم کیسے اُس کے دِل کو کیا محسوس ہو رہا تھا اس وقت۔

مکان میں گھُستے ہی اُسے عجیب بدلتی ہُوئی گھر کی حالت معلُوم ہُوئی کہ اُس نے دیکھا کہ کاٹے ہُوئے بانسوں ایک بڑی باڑ لگا کر صحن کے بیچوں بیچ سے گھر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ رام نے اچھی طرح ہلا کر دیکھا وُہ بانسوں کی دیوار کافی مضبُوط تھی اور اسکا توڑنا بہت مشکل تھا۔ صحن سے ہوتا ہُوا وہ دُوسرے گھر میں آیا وہاں اُس نے دیا جلتے ہُوئے پایا اور باہر ہی گردن بڑھا کر چُپ چاپ اُس نے اندر کا حال چال دیکھنا چاہا۔ گھر میں تو کوئی دکھائی نہ دیا۔ لیکن پیتل اور کانسی کے برتنوں کا ڈھیر ضرور وہاں پڑا تھا۔

یہ برتنوں کا ڈھیر، ایکدم خاموشی اور صحن کے دو حصّے یہ معاملہ کیا ہے اُسکی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ پھر اس بات میں ذرا بھی شک نہ رہا کہ صبح کے ڈرامہ سے اِس معاملہ کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ صبح کا منظر، بھابھی کو چوٹ لگنا اور اُسکا سر پکڑ کے بیہوش سا ہو جانا اُسکی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا اُسکا دِل ایکبار کانپ اُٹھا اور اپنے کمرے میں لوٹ لگا اور بیٹھک کے دوسرے حصّہ کی آہٹ سُننے کی کوشش کرنے لگا وہ اپنی کھوجبی بھول گیا۔

رات کچھ زیادہ نہیں بیتی تھی کوئی نو بجے کا وقت ہوگا بھوک سے وہ بے چین ہو کر لاچار ہو کر اُٹھا اور دُوسرے حصّے میں جانیوالے دروازے کو کھٹکٹایا۔ بینیا نے آکر دروازہ کھولا اور الگ کھڑی ہو گئی

رام نے اُسے دیکھتے ہی پُوچھا۔۔۔" بھابھی کہاں ہیں بینیا۔۔۔؟"

بینیا۔۔۔" اپنے کمرے میں سوئی ہوئی ہیں۔۔۔"

رام بھابھی کے کمرہ میں آیا۔ اُس نے دیکھا کہ بھابھی تو چُپ چاپ چادر اوڑھے لیٹی ہیں اور نیچے چٹائی بچھا کر دِگمبری اپنی لڑکی سُردھنی کو لیکر بیٹھی ہوئی ہے۔ گوبند بھی اُسی کمرہ میں کھیل رہا تھا۔

گوبند کو اپنے چچا رام سے بہت پیار تھا۔ رام کو دیکھتے ہی وہ اپنا کھیل چھوڑ کر چچا کے پاس دوڑ آیا۔ اور چچا کے دونوں ہاتھ پکڑ بچوں کے مانند جھولتے ہوئے بولا ۔۔۔ "چچا۔ تمھارا گھر اُس طرف ہے۔ اِدھر ہمارا گھر ہے۔ بابوجی نے کہا ہے کہ اگر تم اِس گھر میں گھسو گے تو تمھارے پاؤں توڑ دوں گا۔"

رام نے گوبند کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن انہیں بات کو سوچتا ہوا چپ چاپ نارائنی کے پیروں کی طرف بیٹھ گیا۔ اسکے بیٹھتے ہی نارائنی نے اپنے پاؤں سکوڑ لئے اور دوسری طرف کروٹ بدل لی۔ رام کچھ بولا نہیں۔ لیکن دِگمبری کو رام کی موجودگی برداشت نہیں ہو رہی تھی اُس نے اپنی چھوٹی لڑکی سورو سے کہا۔ "سرو۔ بول نہ تیرے چچاجی نے کیا کہا ہے؟ کہدے نہ اِس سے؟"

سردھنی رٹائے ہوئے فقرے بول گئی ۔۔۔ "چچاجی نے کہا ہے آپ یہاں مت آیئے۔ کل سویرے۔ کیا مال

مال ۔۔۔ زمین جائیداد کا بٹوارہ ۔۔۔"

سردھنی (اپنے کہے ہوئے فقرے کو مکمل کرتے ہوئے) "کل صبح پنچوں کو بُلا کر آپکی زمین جائیداد کا بٹوارا کر دیا جائے گا ۔۔۔" دِگمبری نے اسے گھورتے ہوئے کہا ۔۔۔ "قسم کھلانے کی بات تو کہہ نا بیوقوف کہیں کی"

سردھنی ۔۔۔ "چچاجی نے دیدی کو قسم دیدی ہے نہ آپکو کھانا دینگی نہ بات ہی کرینگی۔ چچاجی نے یہی کہا ہے"

نارائنی کو سردھنی کی یہ باتیں بالکل پسند نہ آئیں اور اُسی بیچ ہی میں قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

۔۔۔ "اچھا ہو گیا۔ اب بس بھی کر۔"

سردھنی تو چپ ہو گئی لیکن دِگمبری کب ماننے والی تھی فوراً بول اُٹھی ۔۔۔ "بات تو ٹھیک ہی ہے بیٹا تم تو کسیکو ادھموا کر ڈالو۔ اور وہ کچھ بولے بھی نہیں؟ کچھ بھی ہو یہ تو اُسے غلط نہیں کہہ سکتی۔ اب آخر وہ قسم بھی نہ کھلاتے تو کیا کرتے۔ اب تو تمھارا اِس گھر میں کھانا پینا اور اُٹھنا بیٹھنا اور نہیں چل سکتا۔ کیونکہ تم جب چاہو کسی کا خون کر سکتے ہو۔ پھر نارائنی کو بھی اپنے شوہر کی قسم کا خیال تو رکھنا ہی ہوگا ۔۔۔"

اُسی وقت سردھنی ماں سے بولی ۔۔۔ "ماں چلو نا کھانا نہیں دو گی کیا؟ مجھے بھوک لگی ہے۔"

دِگمبری سردھنی کے اس طرح ٹوکنے سے جھلا گئی ۔۔۔ "ٹھہر نا لڑکی۔"

رام ساری باتیں بُت کے مانند بیٹھا سنتا رہا۔ اسوقت اگر گھر میں آگ بھی لگ جاتی تو وہ اسوقت نہ اُٹھ سکتا تھا۔ شائد اُس سے وہاں سے اُٹھا بھی نہ جاتا۔ اپنے دل میں ایک طرف تو

رونا آرہا تھا۔ لیکن دوسری طرف ڈگمبری کی تیر کی طرح چبھتی ہوئی باتیں بھی انتقام کی آگ کو بھڑکا رہی تھیں۔ اسی جھگڑے رگڑے میں ایکدفعہ بھی وہ نارائنی کے سامنے نہ ٹک سکا تھا۔ اُسکی آنکھیں ایکبار بھی ساون بھادوں نہ برسا سکی تھیں۔ ابھی بھابھی کے آنچل میں منہ چھپا کر اتنا ہی کہہ سکنے کیلئے ــ "بھابھی اب کرولگا" اُسکی زبان تک نہ کھلی۔ یہ چھوٹا سا جملہ جانے کتنی دفعہ ایسے وقت اُسکی حفاظت کر چکا تھا۔ آج ایسی خراب حالت میں بھی یہ الفاظ اُسکی زبان پر نہ آئے۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گلے تک آتے ہی جیسے کوئی اُسکی زبان پر تالا لگا رہتا ہے ــ رام کو اسطرح بالکل چپ چاپ بیٹھا دیکھکر نارائنی نے سردمہری سے کہا ــ "اِسے چلے جانے کو کہدو۔"

اِس دفعہ رام نے اپنی ہچکی کو روکتے ہوئے کہا ــ "ہاں اِسے جانیکو کہدو۔ معلوم ہوتا ہے مجھے بھوک لگتی ہی نہیں ہے نا۔ صبح کا کھایا ہوا ہیں نے ــ ؟"

نارائنی ذرا تیز ہو کر بولی ــ "جان سے مار ہی کیوں نہ ڈالا؟ پھر پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ جا پنیتا کے پاس ــ"

رام ــ "میں نہیں جاتا پنیتا کے پاس۔ کسی کے پاس نہیں جاؤنگا۔ میں بھوکے ہی سو جاؤنگا"
اتنا کہکر رام جھلا کر زمین پر پاؤں پٹکتا سارے گھر کو سر پر اُٹھاتا اپنے حصے کی طرف چلا آیا اور آکر زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر آکر لیٹ گیا ــ تھوڑی دیر بعد پنیتا کچھ کھانا لیکر رام کے کمرے میں آئی۔ رام اپنے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر لیٹا ہوا تھا۔ پنیتا کھانے کی تھالی زمین پر رکھ کر رام سے مخاطب ہوئی ــ "چھوٹے بابو اُٹھئے کھانا کھا لیجئے"

اُسکی آواز سنتے ہی رام جھٹ سے اُٹھ بیٹھا اور اُسکو لال آنکھیں دکھلاتے ہوا بولا۔ "تو کیا تم یہاں کیوں آئی ہے؟ دور ہو جا میری نظروں سے۔ میں تیری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ میرے گھر سے چل جا۔ میں تیرا کھانا نہیں کھاؤنگا۔ لیجا یہاں سے۔ اتنا کہہ کر رام نے تھالی پنیتا کی طرف دھکیل دی۔

پنیتا کھانا رکھ کر اُلٹے پاؤں لوٹ گئی۔ لیکن رام نے تھالی، اور گلاس اٹھا کر پھینکدیا۔ برتن جھن جھن کرتے ہوئے صحن میں جا گرے ــ صبح شیام لال کے کچہری چلے جانیکے بعد رام اپنے صحن میں آکر یہ کہتے ہوئے چہل قدمی کرنے لگا ــ "میں کوئی قسم وسم نہیں مانتا۔ اونہہ! آگئے بڑے قسم کھلانیوالے۔ وہ ہوتے کون ہیں قسم دینے والے؟ کیا ہمارے اپنے بھائی ہیں؟ وہ میرے کوئی نہیں ہیں۔ اُنکی بات میں نہیں مانتا۔ میں نے بھابھی کو تھوڑے ہی مارا تھا۔ اُس بڑھیا ڈائن چڑیل کو مارا تھا جو ہمارا سب کچھ کھانے آئی ہے۔ بھابھی کو تو نا۔

لگ گیا تھا اور اسکے لئے کوئی کون قسم کھلاتا ہے؟ اُس حصّہ کے سب لوگ اِن باتوں کو اچھی طرح سُن رہے تھے لیکن جواب کسی نے نہ دیا۔ کچھ دیر ٹھہر کر رام نے پھر بکنا شروع کیا۔۔۔ "ٹھیک ہی تو ہے: سب اچھا ہے نہ بات چیت کریں اور نہ کھانے کو دیں۔ میں کسی سے مانگنے بھی نہیں جاتا۔ بڑے آرام سے دال روٹی ترکاری وغیرہ اچھی اچھی چیزیں بناؤنگا اور بڑے مزے سے پیٹ بھر کر اکیلے ہی ڈٹ کر کھاؤں گا۔ تب میری پرواہ نہیں تو میں بھی کسی کی منّت کیوں کروں؟ میں بھی آج سے نہ تو کچھ مانگونگا اور نہ بولونگا۔ اس میں میرا کچھ نقصان تھوڑے ہی ہو جائیگا"۔۔۔۔ اِن باتوں کو کہہ کر رام جواب کے انتظار میں تھوڑی دیر تک رُکا رہا۔ لیکن اُدھر والوں نے اُن باتوں کا کچھ جواب نہ دیا۔ تب رام نے بھولا کو آواز لگائی "۔۔ او بھولا۔ بھولا رے۔ ادھر آ۔۔"

رام کے آواز لگانے پر بھولا وہاں کا کام کاج چھوڑ کر رام کی طرف چلا آیا اور کہنے لگا۔۔۔۔ "چھوٹے بابو کیا حکم ہے؟"۔۔۔۔ رام نے اُس سے کہا۔۔۔ "دیکھ بھولا۔ تو اب میرا نوکر ہے۔ اُس گھر میں اب پاؤں بھی نہ رکھنا۔ اور اس بات کا بھی خیال رہے کہ میری اجازت کے بغیر کوئی بھی اس گھر میں گھسنے نہ پائے اور اگر کوئی زبردستی کرے تو اسکی ٹانگ توڑ دینا۔ سمجھ گیا نا بھولا۔ اور ہاں دیکھو بیٹیا بھی اس مکان میں گھسنے پائے۔ وہ اُس گھر کی خادمہ ہے نا؟ اچھا اب آ میرے ساتھ۔ ہم لوگ مزے سے اچھی اچھی چیزیں بنائینگے اور ڈٹ کر کھائینگے"

اتنا کہہ کر رام بھولا کو لئے رسوئی گھر میں آیا اور تھال لوٹا وغیرہ برتن جھن جھن بجا کر بڑے زور شور سے کھانا بنانے کی تیاری کرنے لگا۔ ساتھ ہی اُس نے بھولا کو پہلے چاول اچھی طرح لانے کا حکم دیا اور بھولا چاول دھونے چلا گیا۔۔۔۔ نارائینی اس حصّے میں رسوئی گھر کے دروازے کے پاس بیٹھی ہوئی یہ سب باتیں سُن رہی تھی۔ لیکن متلون مزاج دگمبری کو کہاں چین تھا وہ دروازہ کی دراز سے بڑے غور سے رام کے حصّے کی ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد نارائینی کے پاس آ کر مُنہ کی ہنسی بیکار دبائے کھس کھس کر بتانے لگی۔۔۔ "نارائینی دیکھو تو بابو کتنی عقل کا مالک ہے۔ وہ لوگ بڑھیا بڑھیا کھانے اور ترکاری بنا کر کھائینگے۔ چولھے پر اُس نے ایک بڑی سی پتیلی کی ٹلوئی میں لبالب چاول بھر کے چڑھا رکھی ہے اِس پر مزا یہ ہے کہ پانی برائے نام بھی نہیں ڈالا۔ صرف چاول دھو کر ہی ڈال رکھے ہیں۔ دیکھتی ہے نارائینی یہ کھانا بنا رہا ہے۔ ٹلوئی میں اتنا چاول بھی کوئی بھرتا ہے؟ پھر پانی نہ ہونے سے کیا چاول جل کر کوئلہ نہ ہو جائینگے۔ علاوہ ازیں کھانیوالے دو آدمی اور بھات بنایا جا رہا ہے محلے بھر کیلئے۔ اس پر دماغ یہ ہے کہ کہتا ہے اُسے برسا۔

کھانا بنانا آتا ہے۔ آج پچاس سال سے زیادہ ہوئے مجھے رسوئی بناتے ہوئے۔ لیکن کبھی اِس بات کا غرور نہیں کیا۔ کبھی اپنے مُنہ سے یہ نہیں کہا کہ مجھے کھانا بنانا بہت اچھا آتا ہے۔ مَیں تو چاول اِتنا بڑھیا تیار کرتی ہوں کہ کوئی بھی بڑی آسانی سے ایک ایک دانہ الگ الگ کر سکتا ہے۔ میں تو اتنا ناپ کے پانی دیتی ہوں کہ دوبارہ دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کوئی میرے ساتھ رسوئی کرنے کی شرط لگالے تو۔ اگر کھانے والے میری رسوئی کی تعریف نہ کریں تو کہہ دینا۔"

دِگمبری کی اپنی اِس جھوٹی تعریف سُنکر نارائینی نے مُنہ جھکا دیا اور اپنی گردن دوسری طرف پھیر لی لیکن بینیا بھی کم نہ تھی وہ قریب ہی کھڑی سب کچھ سُن رہی تھی۔ اسکے علاوہ دِگمبری کچھ کہے اور بینیا نہ بولے یہ ناممکن تھا، وہ کہہ ہی تو بیٹھی —— "یہ لو، واہ بڑی ماں جی۔ آپ اپنا مقابلہ کل کے دُودھ پیتے بچے سے کر رہی ہیں اور کبھی آج تک اُن نے خود ایک گلاس پانی بھی ہاتھ سے نکالکر پیا ہے جو آج کھانا پکاکر کھلائیگا"

نرت کالی اِس گھر کی بڑی پُرانی خادمہ تھی وہ رام کی ماں ہی کے وقت سے اِس گھر میں کام کر رہی نارائینی گڑیا سی سجی ہوئی بہو بنکر اُس گھر میں آئی تھی۔ نارائینی اور رام سے اُسے بہت پیار تھا۔ اُسے دِگمبری کا اِس طرح رام کے پیچھے پڑکر گھر سے نکلوا دینا ذرا بھی پسند نہ تھا وہ اُسی وقت سے کچھ نہ کچھ کہنے موقع ڈھونڈھ رہی تھی اِسی لیے اُس نے اِس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

اپنی ماں کی دیکھا دیکھی سُردھنی بھی کبھی کبھی جاکر دروازے کی دراز سے رام کے جیمنے کا حال چال دیکھ لیتی تھی۔ قریب گھنٹہ بھر بعد وہ اپنی بڑی بہن کے پاس آ اُسکا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی بولی ——

"او دیدی آؤ چلیں۔ چلکر ذرا دیکھو تو۔ رام بھیا کچّا بھات کھا رہے ہیں۔ ساتھ میں بھی کچھ نہیں ہے۔ صرف بھات ہی کھا رہے ہیں۔ اچھا دیدی۔ کیا کچّا بھات کھانے سے پیٹ درد نہیں کریگا رام بھیا کا۔"

سُردھنی کی باتیں سُنکر دُکھ سے نارائینی کا دِل بھر آیا لیکن رو نہ سکی۔ اب اُس سے بیٹھا نہ گیا وہ سُردھنی سے ہاتھ چھڑا کر اپنے کمرہ میں آ بستر پہ گر پڑی۔ اُسکا دِل اسوقت اِتنا دُکھی تھا کہ الفاظ میں طاقت نہیں جو بیان کر سکے۔ رہ رہ کر اُسے یہی خیال آتا تھا کہ رام جو اُسکے پیٹ کے لڑکے کی ہی طرح ہے آج بھوک سے بے چین ہو کر اُسکے ہی سامنے کچّا بھات کھا رہا ہے۔ اور وہ اِتنی لاچار ہے کہ کچھ کر بھی نہیں سکتی۔ اِنہیں سب باتوں کو سوچ کر جیسے جیسے وقت گزرتا چلا گیا۔ اُسکی دلی حالت بد سے بدتر اور زیادہ تکلیف دہ ہوتی چلی گئی۔

دوپہر کے وقت شیام لال کے کھانا کھا کر چلے جانیکے بعد دِگمبری نارائینی کے کمرہ میں آئی اور کہا ـــــــ "او نارائینی چل۔ جو کچھ ہو تھوڑا بہت کھالے۔ چوٹ کی وجہ سے تھوڑا بخار تو ضرور آگیا ہوگا لیکن کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ میں کہتی ہوں تھوڑا سا کھا لینے سے کچھ نقصان نہ ہو جائیگا۔ چل اُٹھ بیٹی"

نارائینی پائنتی پڑی چادر کو اور بھی اچھی طرح سے لپیٹ کر ماں سے بولی ـــــــ "ماں مجھے پریشان نہ کرو۔ چپ چاپ مجھے سونے دو۔ میں کچھ کھانا نہیں چاہتی۔ تم جا کر کھالو۔"

دگمبری ـــــــ "چل بھات نہ کھا دو روٹیاں ہی پتلی پتلی تیار کر دوں گی۔ چل آ ـــــــ"

نارائینی ـــــــ "نہیں میں کچھ نہ کھاؤں گی ـــــــ"

دگمبری ـــــــ "کیا کہتی ہے نارائینی۔ کل سے تو نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ نہیں کھانے سے کیسے چلے گا؟ ابھی تو سارا دن پڑا ہے۔ اُٹھ روٹی ہی کھالے۔ ـــــــ"

نارائینی نے اپنی ماں کی بات کا کچھ جواب نہ دیا اور چپ چاپ پڑی رہی۔ لیکن بِنیا باہر کھڑی دِگمبری کا یہ سب دکھاوے کی باتیں دیکھ رہی تھی۔ نارائینی کے چپ ہو لینے پر وہ بول اُٹھی ـــــــ "بڑی ماں جی آپ بیکار کیوں گویا درد مول لے رہی ہیں۔ اگر یہاں کھڑی رہ کر آپ رات دن چلاتی رہیں تو بھی اُنہیں اُٹھا کر نہ کھلا پائینگی۔ چوٹ کی وجہ سے بخار آگیا ہوگا۔ اسلئے ذرا چین سے ماں جی کو گھنٹے دو گھنٹے سو لینے دیجئے جس سے اُنہیں کچھ آرام ملے"!

دِگمبری کو بِنیا کا بولنا پسند نہ آیا۔ وہ کمرہ کے باہر جاتی ہوئی کہتی گئی "تم لوگوں کے کھیل تمہیں لوگ جانو بابا میری سمجھ میں تو کچھ۔ ہاں چوٹ کی وجہ سے ذرا بخار آگیا ہوگا۔ کیا اتنی ذرا سی بات کیلئے کوئی دن رات فاقہ کر کے اِس طرح پڑا رہتا ہے۔ مجھ سے تو بابا یہ سب نہیں دیکھا جاتا۔"

شام کے وقت نارائینی برآمدے میں آکر بیٹھ گئی۔

رام ابھی سکول سے لوٹ آیا تھا۔ اپنا بستہ کتابیں جہاں تہاں پھینک وہ گاؤں کی دکان سے چبینا خرید لایا اور وہیں دونوں جیبیں بھر کر آنگن میں گھوم گھوم کر کھا رہا تھا۔ صبح ہی کے مانند وہ اب بھی باڑ کے پاس آکر اُس گھر والوں کو زور زور سے سنا کر کہنے لگا ـــــــ

"مجھے الگ کر دینے سے کیا بگڑ گیا؟ بھات کھا کر صبح سکول گیا اور اب مزے سے چبینا

کھا رہا ہوں۔ میرا کیا میں تو اب بڑے آرام سے کھاؤں گا اور رہوں گا ——"

رسوئی گھر میں دیا جلا کر رام کھانا بنانے کی تیاری کرنے لگا۔ لیکن کچھ دیر بعد رام رسوئی گھر سے نکل آیا اور صحن میں کھڑا ہو کر چیخنے لگا —— "میرا چاقو کہاں ہے؟ میں ترکاری کس سے کاٹوں گا؟ میرے حصے کا سِل بٹہ کہاں ہے؟ میں مصالحہ کس پر پیسوں گا؟"

تھوڑی دیر بعد پتیا نے جواب دیا۔ —— "ماں جی نے کہا ہے کہ کل چاقو اور سِل بٹہ خرید کر بھیج دیا جائیگا۔"

رام —— "نہیں میں خریدا ہوا سِل بٹہ نہیں چلتا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔" اتنا کہہ کر رام پاؤں پٹکتا ہوا رسوئی گھر سے چلا گیا —— تھوڑی دیر بعد پھر آنگن میں آ کر اس نے بولنا شروع کر دیا —— "کیوں میرے کنگش کو پکڑوا منگوایا؟ کیوں اِس بڑھیا نے میرے پیچھے پڑ کر مجھے الگ کروایا؟ میں نے تو ٹھیک کیا جو اُسے گالی دی۔ پھر گالی دوں گا اور خوب دوں گا۔ ڈائن بڑھیا۔ کالے منہ والی۔ ہمارے گھر میں ہمارا سب کچھ کھانے اور اُجاڑنے آئی ہے۔ یہ ڈائن بڑھیا مر جائے جلدی اور اگلے جنم میں چڑیل بنے —— !!!"

اپنی شان میں اِتنے خوبصورت خطابات سُن کر دِگمبری جل کر کوئلہ ہو گئی اور چیختی ہوئی نارائنی سے بولی —— "سُنتی ہے نارائنی یہ سب زبردستی آنکھ میں اُنگلی گھسیڑ کر لڑنا نہیں تو اور پھر کیا ہے؟ یہ لڑکا مجھے چڑیل کہتا ہے۔"

نارائنی نے اِسے سُن کر بھی نہ سُنا اور باغیچہ کی طرف مُنہ پھیر لیا۔ اور اُسی طرف دیکھتی رہی ایسا ظاہر کرتے ہوئے جیسے اُس نے کچھ سُنا ہی نہ ہو۔

دوسرے دِن رام کی حالت میں ایک خاص تبدیلی سی آ گئی۔ اُس کا چلّا چلّا کر اِس طرف کے لوگوں کو باتیں سُنانا بالکل بند ہو گیا۔ آج وہ حیران و ششدر تھا۔ جیسے اُس کے دِل میں خوف کا بھوت گھُس گیا ہو۔ اِس واقعہ کو ہوئے دو دِن گزر چکے تھے۔ اُس کی بھابھی نے اُس کو نہ تو بلایا تھا اور نہ ہی اُس کو کھانے کو دیا تھا۔ یہاں تک کہ اُسے بُلا کر جھاڑ بھی نہیں بتائی۔ اگر اُسے بُلا کر جھاڑ بتا دیتی یا دو چار تھپڑیاں ہی رسید کر دیتی تو شاید اُسے اِتنا دُکھ محسوس نہ ہوتا۔ جتنا کہ اِس

وقت اُسے یہ علیحدگی اور نہ بولنا پریشان کر رہے تھے۔ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا ہے۔ اپنی بھابھی کا اس طرح کا سلوک اُس نے کبھی نہیں دیکھا۔

اُسے رہ رہ کر اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اور ایسی غلطی کے لئے وہ باورچی خانے کے دروازے میں بیٹھ کر طرح طرح کے بیان دیتا رہا۔ ایک بار اُس نے کہا — "میں نے بھابھی کو مارنے کے لئے امرود تھوڑا پھینکا تھا۔ وہ تو میں نے بلّی کو مارا تھا۔ لیکن اُن کو لگ گیا۔" پھر وہ بولا — "میں تو یونہی امرود اِدھر اُدھر زمین پر پھینک رہا تھا۔ لیکن درمیان میں بھابھی آ گئی۔ ڈر کر میرا ہاتھ بہک گیا اور اُسکی پیشانی پر امرود جا لگا۔" ایک بار اُس نے کہا — "میں نے کبھی کو بھی گالیاں نہیں دی تھیں" پھر بولا — "میں نے تو گوبند کو گالیاں دی تھیں"۔ اِسی طرح وہ بہت دیر تک بغیر سر پیر کی کہتا رہا۔ مگر مانند سابق کے آج بھی اُسکی باتوں کا جواب اِس طرف سے کسی نے نہ دیا ہاں یا نا — جیسے اُس طرف سے کوئی سُن ہی نہیں رہا تھا۔

ایک بار اُس نے بڑی تکلیف کے ساتھ شرم ترک کر کے یہاں تک کہہ ڈالا — "اب نہیں کروں گا معافی مانگتا ہوں"۔ جب اِس بات کا بھی کوئی جواب نہیں ملا تو مارے دُکھ کے وہ رو پڑا۔ وہ بار بار سوچنے لگا کہ وہ کِس طرح اپنی بھابھی کو خوش کرے۔ جب بھابھی نے ہی جو اِس کی ماں کی جگہ ہے، اِس طرح سے الگ کر دیا ہے تو وہ اب کہاں جائے؟ کِس کے پاس اور کِس طرح جا کر رہے یہ اُسکی سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ آج نہ ہی تو اُس نے کھانا تیار کرنے کی کوشش کی اور نہ وہ سکول ہی گیا۔ مارے رنج کے نہ تو اُسے کچھ سوجھ ہی رہا تھا۔ اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو کسی کام کرنے کے لائق پا رہا تھا۔ جب وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ تو چُپ چاپ پڑ کر سو رہا۔ دِن میں بھی اُداس رہا۔

اِدھر نارائینی کو بھی اِن سب باتوں کا بیحد دُکھ تھا۔ رام کو وہ اپنے لڑکے کے مانند ہی مانتی تھی۔ اُسکے دیکھتے ہی دیکھتے رام کھانے پینے کیلئے اس قدر تکلیف اُٹھا رہا تھا اور وہ نہ جانے کیسے برداشت کر رہی تھی۔ اُسکو بہت دُکھ تھا۔ کل دِن بھر وہ سب سے چھپ کر روتی رہی۔ اور ایک دِن پہلے اُس کو بخار آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ دُکھ کی وجہ سے اُس سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں جاتا تھا۔ آج دوپہر کے وقت دگمبری کسی طرح سے نہ مانی اور کٹورے میں دودھ لیکر نارائینی کے پاس آئی وہ

وُہ نارائینی سے دُودھ پینے کیلئے اصرار کرتی ہُوئی بولی ــــ "اُٹھ نارائینی تھوڑا سا دُودھ پی لے بغیر آب و دانہ کے کیا اپنی جان دے دیگی۔ تجھے یہ دُودھ پینا ہی پڑے گا ــــ"

نارائینی کو اِنکار کرنے میں بڑی شرم سی محسوس ہُوئی وُہ "نہ" نہ کرسکی۔ چُپ چاپ اُٹھ کر اُس نے ماں کے ہاتھوں سے دُودھ کا کٹورا لے لیا۔ اور اُس میں سے تھوڑا سا دُودھ پی کر کٹورہ پلنگ کے نیچے رکھ دیا۔ اِس طرح بجھے دِل سے دُودھ پی کر وُہ کروٹ بدل کر سو گئی۔

رات کے نو بجے کے قریب جلدی جلدی قدم اُٹھاتی ہوئی پنیا نارائینی کے پاس آئی اور آہستہ سے کہا ــــ "بی بی جی! رات کافی ہو چکی ہے۔ لیکن چھوٹے بابُوجی کی طرف گھر اُسنا ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا"

نارائینی چونک کر اُٹھ بیٹھی اور پنیا کو گلے لگاتی ہُوئی بولی ــــ "پنیا! اب تُو ہی دیکھ آکر وُہ کہاں ہے۔ مکان کے اندر ہے یا کہ نہیں"۔

پنیا کی بھی پلکیں بھیگ گئیں اور وُہ اپنے آنچل سے نارائینی کی آنکھیں پُونچھتی ہُوئی بولی ــــ "بی بی جی! چھوٹے بابُو کل سے ہی بہت ناراض ہیں۔ اِس لئے مجھے اُن کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوتی لیکن آپ گھبرائیں نہیں میں ابھی بھولا کو بھیج کر اُن کا پتہ منگاتی ہُوں"۔

اِتنا کہہ پنیا بھولا کی تلاش میں چلی آئی۔ صحن میں جنگلے کے پاس آکر اُس نے بھولے کو آواز دی بھولا دروازے میں بیٹھا تھا۔ پنیا کے بُلانے پر وُہ اُس کے پاس آیا، اور اُسکے استفسار کرنے پر اُس نے اُسے بتایا کہ رام اپنے مکان میں سو رہا ہے۔ یہ سُنکر نارائینی نے اطمینان کا سانس لیا اور بھگوان کا شکریہ ادا کیا

دُوسرے دِن صُبح ہونے سے پہلے ہی نارائینی بیدار ہُوئی اور اپنے کل کے بُخار کی رَتی بھر پرواہ نہ کرتے ہُوئے حوائجِ ضروری سے فراغت حاصل کر کے بڑی محنت سے کھانا تیار کرنے لگی۔ وُہ جب آدھا کام ختم کر چُکی تو دِگمبری اُٹھ کر اُس کے پاس آئی۔ نارائینی کا اس طرح سے کھانے پینے کی بہت سی اشیاء تیار کرتے دیکھ کر وہ بڑی حیران ہُوئی۔ اُس نے بڑی ہی کرخت آواز میں نارائینی سے کہا ــــ تُو تو کل بُخار کی وجہ سے سَر ڈھلنے پر تھی نا؟ اِس کے علاوہ تُو نے تین دِن سے کچھ بھی نہیں کھایا آج تُو اِتنی سویرے کس خوش قسمت کے لئے اِتنی چیزیں تیار کر رہی ہے؟ میں پُوچھتی ہُوں نارائینی! یہ سب کیا ہو رہا ہے ــــ"

نارائینی نے بڑی نرم آواز میں جواب دیا ـــــ "ماں آپ دیکھ تو رہی ہیں کہ کھانا تیار کر رہی ہوں۔"

"وہ تو سب دِکھائی دے رہا ہے۔ مگر یہ سب کس کی خاطر اور کیوں ہو رہا ہے؟ کیا اب تجھے میرے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں ہے؟"

نارائینی نے جیسے دِگمبری کی یہ بات سُنی ہی نہیں۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چُپ چاپ اپنا کام جاری رکھا۔

کل رام دِن بھر اپنے کمرے میں لیٹا ہُوا طرح طرح کی باتیں سوچتا رہا۔ رِہ رِہ کر اُس کو یہی خیال آتا تھا کہ بھابھی کو گہری چوٹ لگی ہے یہاں تک کہ وہ چوٹ کا نتیجہ جاننے کیلئے ایک کچا امرود لے آیا اور وُہ بار بار اپنی پیشانی پر مارنے لگا۔ اِس سے بھی جب اُس کو تسلّی نہ ہوئی تو وُہ یہ سوچنے لگا کہ اُس نے بھابھی کو دانستگی یا نادانستگی کے عالم میں مارا تو ضرور ہے اور اِس سے اُنکو چوٹ بھی لگی ہے اور کافی چوٹ لگی ہے۔ نہیں تو اِس طرح سے وُہ سَر تھام کر بھلا بیٹھ کیوں جاتیں۔ اگر وُہ کونسا کام کرے کہ جس سے یہ کلنک دُھل جائے اور اس کی بھابھی خوش ہو جائے۔

کافی دیر سوچتے رہنے کے بعد اچانک اُسے ایک بات یاد آئی۔ کچھ دِن پہلے بھابھی نے اُس سے کہا تھا کہ وُہ یہاں سے چلا جائے۔ اُس کے نہ کہنے پر بھابھی نے پھر کہا تھا کہ تب وہی کہیں چلی جائے گی اور اُسے گوبند کو لکھا پڑھا کر آدمی بنانا پڑیگا۔ آخر یہی بات اُسے جچی۔ کہ اگر وہاں سے کہیں چلا جائے تو اُسکی بھابھی ضرور خوش ہوگی ـــــ اب وُہ جائے تو جائے کہاں؟ اُس نے یہ سُن رکھا تھا کہ اُسکے ماموں تارکیشور کے پاس کہیں رہتے ہیں۔ لیکن ٹھیک کہاں رہتے ہیں، اسکے متعلق اس کو کچھ علم نہ تھا۔ اُس نے یہی فیصلہ کیا کہ وُہ یہاں سے تارکیشور کی طرف چلا جائے گا اور وہیں کہیں اُسکے ماموں کا مکان ہوگا جسکو کہ وُہ تلاش کر لیگا۔ لیکن یہاں سے تارکیشور تک پہنچنے کیلئے بھی تو کچھ پیسوں کی ضرورت ہوگی اور اُس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ اِسکے لئے اُس نے یہی سوچا کہ بھابھی سے اگر مانگا جائے تو وُہ ضرور ایک یا دو روپیہ دیدینگی۔ اِسطرح سے یہاں سے چلے جانے کا آخری فیصلہ کر کے اُٹھا اور بھولا کو آواز دی۔ اِسی دوران اُس نے ضروری اشیا کی ایک چھوٹی سی گٹھڑی باندھ لی۔ بھولا آیا تو اُس کو اُس نے اپنے مجوزہ سفر کے متعلق بتایا اور اُسکو اِس بات پر رضامند کر لیا کہ وُہ اندر جا کر بھابھی سے دو روپے مانگ لائے۔

ناراینی اب تک کھانا تیار کر چکی تھی۔ اور ایک تھال میں سبھی چیزیں سجا رہی تھی۔ اسی دوران بھولا نے آ کر آواز دی ۔۔۔۔ "ماں!"

ناراینی نے منہ پھیر کر بھولا کو دیکھا۔ اور اس سے کہا ۔۔۔۔ "کیوں کیا ہے؟"

بھولا گائے چرانا، کھیت وغیرہ پر جانا سبھی کام باقاعدہ طور پر کیا کرتا تھا۔ لیکن وہ رام کے خوف کے مارے اس گھر میں قدم بھی نہ رکھتا تھا۔

ناراینی کو اپنی طرف مڑتے دیکھ کر آہستہ سے بولا ۔۔۔ "ادھر آئیے ماں جی! آپ سے ایک بات کہنا ہے"

ناراینی بیتاب ہو کر اس کے پاس آئی۔ بھولا نے سمجھایا ۔۔۔ "ماں جی آپ نے کہا تھا نا، وہ کام اب ہو جائیگا۔ صرف دو روپوں کی ضرورت ہے ۔۔۔۔۔"

ناراینی کچھ نہ سمجھ سکی اور پھر بھولا سے پوچھا ۔۔۔ "کیا کام ہو جائیگا میں نے تجھ سے کیا کہا تھا اور کس کو یہ روپے چاہئیں؟"

بھولا نے حیران ہو کر کہا ۔۔۔ "ماں جی! آپ نے ہی تو چھوٹے بابو کو چلے جانے کیلئے کہا تھا لہذا وہ جانے کیلئے تیار ہیں آپ انہیں دو روپے دیدیجئے تاکہ وہ چلے جائیں۔ یہ زیادہ دیر کیلئے رکا رہیں ماں جی!"

بڑی بے چین ہو کر ناراینی بولی ۔۔۔ "میں نے کب چھوٹے بابو کو جانے کیلئے کہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ وہ ہے کہاں ۔۔۔۔؟"

باہر دروازے کے پاس نیم کے نیچے کھڑے ہیں بابا تارکیشور کے پاس کہیں انکے ماموں کا مکان ہے وہیں جائینگے ماں جی! بہت دیر ہو رہی ہے جلدی دو دیجئے۔ ایک روپیہ ہی دیدیجئے۔"

"تو جا بھولا! رام کو اندر بلا لا۔ کہہ دے، میں بلاتی ہوں ۔۔۔۔"

بھولا ناراینی کا حکم پا کر فوراً باہر چلا گیا۔ اور ناراینی پریشان کھڑی رام کی راہ دیکھتی رہی وہ یہی سوچتی رہی کہ وہ کہاں جائے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی رام کندھے پر چھوٹی سی گٹھڑی لٹکائے سر نیچا کئے ہوئے ناراینی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ناراینی بغیر کچھ کہے سنے چپ چاپ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باورچی خانے میں کھینچ لے گئی۔

دُور سے رام کو باورچی خانہ میں لیجاتے دیکھ کر دگمبری بہت حیران ہوئی اور تیز قدموں سے چلکر باورچی خانہ کے دروازے تک آئی۔ اُس نے جھانک کر دیکھا کہ نارآئینی پروسے ہوئے تھال کے سامنے رام کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ اور رام اُس کے سینے کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ نارآئینی کے آنسو اُس کی پیٹھ پر گر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر تک دگمبری حیرت سے دیکھتی رہی، پھر دروازے کے اندر قدم رکھتی ہوئی بولی ــــ "اُف اوہ! اِسی لئے اتنا کھانا تیار کیا جا رہا تھا، کھلایا جائے گا اِس بیٹے کو میرے داماد نے جو اتنی بڑی قسم کھلائی تھی، وہ شاید اُڑ ہی گئی ــــ"

نارآئینی نے مسکرا کر کہا ــــ "نہیں ماں! اُڑ کیوں جائیگی؟ قسم دینے والے کی بات کو میں نے رکھنے کی سعی کی ہے۔ تین دن ہو گئے، نہ میں نے ہی کھایا ہے نہ اُسے ہی کھانے کو دیا ہے۔"

اِس بار دگمبری نے بڑے کرخت لہجہ میں کہا ــــ "اس طرح سے محبت سے کھلا کر معلوم ہوتا ہے اُسکی قسم کے برعکس کیا جا رہا ہے جس نے قسم کھلائی ہے اُس سے ایکبار پوچھ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

نارآئینی نے ماں کے حملہ کو بڑے حوصلہ سے برداشت کر کے کہا ــــ "میں اجازت لے چکی ہوں ماں"

دگمبری کو اِس کا اعتبار نہیں آیا۔ وہ اور زیادہ غصہ میں بھر کر بولی ــــ "میں کل کی دودھ پیتی بچی تو نہیں ہوں نارآئینی تو نے اجازت لے لی اور مجھے پتہ بھی نہ چلا۔"

اِس بار نارآئینی سے اور زیادہ برداشت نہ کیا گیا۔ اُس نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا ــــ "تم کیا جانو گی ماں! کہ کس نے کب مجھے حکم دیا ہے۔ پھر جس کا منہ ہے وہ قسم بھی دِلا سکتا ہے۔" اتنا کہہ کر نارآئینی نے بڑے پیار سے رام کا منہ اُٹھا کر اُس کے گالوں کو تھپتھپایا۔

اور پھر اپنی ماں سے بولی ــــ "جسے چھاتی سے لگا کر بچے کی طرح پال پوس کر بڑا کرنا ہوتا ہے، وہ جانتی ہے کہ اجازت کہاں سے ملتی ہے، آپ کو ان باتوں کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی آپ ذرا میرے سامنے سے ہٹ جائیں! میرا یہ بچہ لگاتار تین دن سے بھوکا ہے ذرا اسے آرام سے کھا لینے دیجئے۔" یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں سے مامتا کے آنسو بہنے لگے۔

دگمبری حیران سی ہو کر تھوڑی دیر تک کھڑی رہی۔ پھر بولی ــــ "تب اِس صورت میں

میرا یہاں رہنا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ میں صاف طور سے کہے دیتی ہوں کہ اب میں اس مکان میں نہ رہ سکوں گی۔"

نارائینی نے فوراً جواب دیا ——— یہی بات میں اتنے دنوں سے منہ کھول کر نہ کہہ سکتی تھی۔ یہ جب بات چھڑی ہے تو پھر میرا بھی یہ کہنا ہے کہ اب آپ کا ہم لوگوں کے ساتھ رہنا نہ ہو سکے گا۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے میرا اتنا بڑا لڑکا سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ لڑکا چاہے شرارتی ہو، یا کسی طرح کا بھی ہو، اپنی آنکھوں کے سامنے میں کسی کو اپنے لڑکے کے پیچھے نہ پڑنے دوں گی۔ آج آپ رہیے۔ لیکن کل آپ کے جانے کا انتظام ہو جائے گا۔ اور آپ کسی بات کی فکر نہ کریے۔ روپیہ آپ کا ہر مہینے پہنچتا رہے گا۔ اور آپ کو خرچ کی تکلیف نہ اٹھانا پڑے گی۔ خیر جس طرح بھی ہو، آپ کسی طرح بھی یہاں نہ رہ سکینگی۔"

دگمبری کو نارائینی کے منہ سے اس طرح کھری کھری سننے کی رتی بھر بھی امید نہ تھی۔ اتنی صاف صاف سن کر، مانو اسے کاٹھ مار گیا۔ اور وہ تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ باہر چلی گئی۔

رام بھی بھابھی کی گود میں بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ دگمبری کے جاتے ہی وہ بول اٹھا ——

"نہیں بھابھی اُن کو یہاں رہنے دو۔ اب میں ایک اچھا لڑکا بن کیا ہوں۔ تم اُن کو ایک موقعہ اور دو"

نارائینی نے بڑے پیار کے ساتھ اسے گلے سے لگاتے ہوئے ہنس کر کہا ——— "اچھا اچھا پہلے تو کچھ کھا پی لے ———

"ایک نوجوان بیوہ — ایک زندہ لاش...

شرت چندر قلوب کی گہرائیوں سے اُبھرنیوالے احساسات کا صحیح ترجمان ہے۔ سرزمین بنگال کے اس مُصنف کے قلم کو پڑھنے والے کے جذبات کو جھنجھوڑ دینے میں ملکہ حاصل رہا ہے۔ اس کی ہر کہانی ہمیشہ ہماری اور آپکی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

"بڑی دیدی" میں شرت چندر کے قلم نے خُود بھی خون کے آنسو رو ئے ہیں اور دوسروں کو بھی رُلائے ہیں۔ یہ ایک ایسی نوجوان بیوہ کی کہانی ہے۔ جسے ایک سادہ لوح نوجوان سے عشق ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اسے ایک دیوی کی طرح پُوجتا تھا۔ کردار و لغزش کردار کے تضاد کی یہ شدید ترین جذباتی جنگ اس ناول میں اتنے مؤثر پیرائے میں تحریر کی گئی ہے کہ مدت تک اس کے نقوش پڑھنے والے کے ذہن پر مسلط رہتے ہیں۔

قیمت فی کتاب 1/

مشورہ بکس — مشہور و معروف ادیبوں کے
مشورہ بکس ۱ شاہکار ارزاں قیمت پر
کے لیے مشورہ بکس خریدیے۔
POCKET BOOK
13
مشورہ بک ڈپو
رام نگر گاندھی نگر پوسٹ بکس 1639 دہلی ۶

تقسیم کار :- نیوتاج آفس پوسٹ بکس نمبر ۱۷۴۹ دہلی